اِقبال ریویو

اقبال اکیڈمی حیدرآباد کا سہ ماہی رسالہ

جنوری ۱۹۷۹ء

خصوصی اشاعت ۔ اقبالیات ماجد

(اقبالیات پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تحریریں)

اِقبال اکیڈمی

"مدینہ منشن"، نارائن گوڑہ، حیدرآباد، آندھرا پردیش (انڈیا)

بدل اشتراک

ہندوستان ۔

زر سالانہ (چار شماروں کیلئے)	......	۱۶ روپئے
قیمت فی شمارہ	... ...	۵ روپئے

بیرونی ممالک (چار شماروں کیلئے)

ذریعہ ہوائی ڈاک	....	۸ ۔ امریکی ڈالر
ذریعہ بحری ڈاک	....	۴ " "

اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد
کا
سہ ماہی
رسالہ

جنوری ۱۹۷۹ء

جلد (۲)
شمارہ (۱)

زرِ سالانہ (۴) شماروں کیلئے
(۱۶) روپے

فی شمارہ (۵) روپے

○ مجلسِ مشاورت :
○ ڈاکٹر عالم خوند میری
○ پروفیسر اسلوب احمد انصاری
○ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید
○ پروفیسر جگن ناتھ آزاد
○ ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ
○ سید عباس رضوی
○ محمد ظہیر الدین احمد

ایڈیٹر :
○ محمد منظور احمد

جائنٹ ایڈیٹر :
○ مصلح الدین سعدی

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ
اقبال ریویو مدینہ منشن، نارائن گوڑہ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹ (اے پی) انڈیا
فون نمبر : 45230

مندرجات

اقبال ۸
پیامِ اقبال ۱۰
شکوہ جوابِ شکوہ ۱۱
جنونِ الحاد ۱۳
مغرب کی ترقی کا راز ۱۵
شیشہ اور موتی ۱۷
پس چہ باید کرد ۱۹
ضربِ کلیم ۲۴
دانشِ حاضر ۳۰
جاوید نامہ ۳۲
ارمغانِ حجاز ۴۹
دو لفظ مردِ خدا کی یاد میں ۵۶
مکاتیب ۵۹

ایک گزارش!

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیرِ انتظام، اقبالیات پر ایک کُتب خانہ قائم ہے۔ علامہ اقبال کی ساری تصانیف اُن کے اوّلین ایڈیشن اور اقبالیات پر کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ہندستان و پاکستان سے شائع ہونے والے بہت سارے اہم رسائل کے خاص نمبر اور دیگر مقتدر رسائل، جن میں اقبال پر مضامین شائع ہوئے ہیں، کثیر تعداد میں اس کُتب خانے میں جمع کیے گئے ہیں۔ اقبال کے عصر پر، اُن کے معاصرین پر بھی کتابیں جمع کی جا رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ سے گزارش ہے کہ اس کتب خانہ کو آپ اپنی کتابیں تحفتہً روانہ فرمائیں۔ کوئی رسالہ کوئی کتاب، جو آپ کی نظر میں اس قابل ہو کہ آپ عطیہ کے طور پر اس کتب خانہ کو دے سکیں تو اپنی اوّلین فرصت میں ہمیں مطلع فرمائیں۔

آپ سب کی اعانت ہی سے یہ کتب خانہ اقبال پر ایک مرکزی کتب خانہ بن سکتا ہے، جہاں اقبال پر ریسرچ اور مطالعہ کی ساری سہولتیں انشاء اللہ تعالیٰ جلد مہیا کی جائیں گی۔ اپنی کتبیں ہمارے پتہ پر روانہ فرمائیے یا اپنے پتہ سے مطلع کیجیے، ہمارا نمائندہ با اجرائی رسید حاصل کرلے گا۔

کتب خانہ اقبال اکیڈیمی۔ مدینہ منشن۔ نارائن گوڑہ۔ حیدرآباد ۲۹…۵۰۰ (اے پی) انڈیا

حرفِ اوّل

مولانا عبدالماجد دریابادی، بیسویں صدی کے ہندوستان کی اُن شخصیتوں میں سے ہیں، جن کا تعلق ہندوستان کی فکری، تعمیری اور علمی زندگی سے بہت گہرا رہا۔ ہندوستانی مفکرین میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جو مشرق اور مغرب کے عصری، فکری دھاروں میں مولانا کی طرح ہندوستان کی نمائندگی کر سکیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں ایسی جلیل القدر ہستیاں زندگی کے مختلف میدانوں میں اُبھریں کہ ہندوستانی اُفق پر دانشوروں کی ایک کہکشاں سی بنتی چلی گئی —— علیگڑھ تحریک کی مایہ ناز ہستیاں، حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک، ڈپٹی نذیر احمد، چراغ علی وغیرہ، بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد جو دوسرا گروپ اس کے بعد کی نسل کا سامنے آتا ہے، اُن میں مولانا ابوالکلام، علامہ اقبال، محمّد علی جوہر، علامہ سلیمان ندوی، حسرت موہانی وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا اس نسل سے تعلق تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۹۷۵ء میں انتقال فرمایا۔ (۸۳) برس کی عمر اور لوگوں نے بھی پائی ہو گی۔ لیکن ۲۰، ۲۲ سال کی عمر سے انتقال تک، مولانا ماجد نے اپنے عصر کو اپنی ایک ایک سانس میں سموئے ہوئے ہر لمحہ کو ایک صدی کا مرتبہ بخشا۔

مولانا عبدالماجد، ایک صاحبِ طرز انشا پرداز، محقق، فلسفی اور نقاد کی حیثیت سے اپنی عمر کی ابتدائی سالوں میں مشہور ہوئے —— اُردو کے علاوہ انگریزی میں بھی اپنے قلم کا لوہا منوایا۔ ان کے مضامین انگلستان کے مشہور علمی پرچوں میں شائع ہوتے تھے۔ مسٹر عبدالماجد اُس زمانے کے اُن ہندوستانیوں میں شامل تھے جن کی عقلیت اور فلسفہ نوازی کی ایک عالم میں شہرت تھی۔ الحاد اور مادیت کی دل خوش کُن وادیوں میں بھی اس عبقری نے عمرِ عزیز کے کچھ دن بتائے —— حقیقت کی تلاش اور سچی علمی لگن ان کی زندگی کا ایک ایسا نصب العین تھا جس کی وجہ سے اِن کی دشت نوردیاں، ان کے مشاہدات اور تجربات انسانیت کے لیۓ اہم بن جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کے فکری حادثے جدید تعلیم یافتہ انسانوں کے لیۓ چراغِ راہ سے کم نہیں۔ فلسفہ کی خارزار وادیوں میں آبلہ پائی کے بعد جب وہ زندگی کی معنویت اور خالق کائنات سے متعارف ہوتے ہیں تو مسٹر عبدالماجد کو دنیا مولانا عبدالماجد کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اِن کے اس سفر کی رُوداد خود ان کے قلم سے ہی مزہ دیتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"۱۹۰۸ء میں عمر کا سولھواں سال تھا کہ میٹرک پاس کر، لکھنؤ میں کالج میں داخل ہوا، اور اب انگریزی کتابوں پر ٹوٹ پڑا۔ اتفاق سے شروع ہی میں ایک انگریز ڈاکٹر کی کتاب سامنے آگئی۔ ظالم نے کھُل کر اور بڑے زوردار الفاظ میں مادّیت کی حمایت کی اور مذہب اور اخلاق دونوں سے بغاوت کی تھی —— خیالات ڈانوا ڈول ہونے لگے —— دماغ پہلے ہی سے مفلوج ہو چکا تھا، اب دل بھی مجروح ہو گیا —— ارتداد دبے پاؤں آیا۔ اسلامیت کو ہٹا، ایمان کو ہٹا خود مسلّط ہو گیا۔ الحاد کا نشہ، بے دینی کی ترنگ، ریشنلزم (عقلیت) سے پینگ بڑھتے —— رگنا سٹیزم (لا ادریت) سے یارانہ گھٹا۔ لندن کی ریشنلسٹ اسوسی ایشن (انجمن عقلیین) کی ممبری قبول کر، سارا وقت ہیوم، مل، اسپنسر، ہکسلے، ہیگل، انگرسول، بریڈلا، ایوشنز، ڈارون اور یونان کے حکماء مادیین ——

ہنٹنگلین وغیرہ نذر ہونے لگا۔ بل کو اتنا پڑھا، اتنا پڑھا کر لڑکوں میں بل کا حافظ مشہور ہوگیا۔ ایف اے کے امتحان کی فیس جانے لگی تو فارم میں جہاں مذہب کا خانہ ہوتا وہاں بجائے مسلمان کے ریشنلسٹ لکھ دیا۔ الحاد اور بے دینی کا دَور کوئی آٹھ سال تک قائم رہا۔"

مولانا آگے لکھتے ہیں کہ ۱۹۱۸ء کے اواخر میں ایک دوست کی تحریک پر بُدھ مت پر انگریزی میں مطالعہ شروع کیا۔ اس کے بعد ہندو فلسفہ کے مطالعہ کا موقع ملا۔ مسز بیسنٹ اور بنارس کے مشہور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس کے انگریزی تراجم اور تالیفات کے ذریعہ مغربیت مادیت اور عقلیت کا جو تیز نشہ سوار ہوا تھا وہ بتدریج ہلکا ہونے لگا۔ اس مطالعہ سے یہ بات ان کے سمجھ میں آئی کہ مادی اور حسی دُنیا کے علاوہ بھی کسی اور عالم کا وجود ہے۔ بھگوت گیتا کے ترجمہ کو پڑھنے کے بعد خدا کا نام قابلِ مضحکہ نہیں رہا ـــــ اسی زمانہ میں مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ کی جلد اول ان کے ہاتھ لگی، اور رسالتمآب صلعم کے بارے میں یہ خیال اُن کے دِل میں پیدا ہوا کہ یہ ایک خوش نیت مصلح قوم تھے۔ مولانا اسی زمانے میں اکبر الٰہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر اور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی سے تاثر قبول کیا ـــــ ۱۹۱۹ء میں مثنوی معنوی ان کے ہاتھ لگی۔ مثنوی کے مطالعہ نے اِن کو اسلام سے قریب کردیا۔ قرآن و رسالت پر ابھی ایمان پختہ نہیں ہوا تھا، بلکہ خیال یہ تھا کہ جب مولانا روم جیسا مفکر اسلام کو سچ سمجھتا ہے تو یہی سچ ہوگا۔

مولانا عبد الماجد مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے جب اسلام کو ایک نسخۂ کیمیا کی حیثیت میں اپنا لیا تو باقی زندگی اسی کے لیئے وقف ہوگئی۔ اُن کی ساری صلاحیتیں جو انشاء پردازی، غور و تفکر، تلاش و جستجو کے میدانوں میں ظاہر ہوئیں، اور ہمارے لیئے اہم ورثہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام اور قرآن کے اطراف ہی پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی عصر میں علامہ اقبال بھی کم و بیش اپنے فکر و فن کے چراغ جلارہے تھے۔ اقبال سے مولانا عبد الماجد کا ربط اور فکرِ اقبال سے اُن کی دلچسپی اِن تحریروں سے ظاہر ہے جو یکجا سامنے آرہی ہیں۔ اقبال کی شخصیت، اُن کی کتابوں پر اور ان کی فکر پر اختصار کے ساتھ لیکن بڑے ہی جامع انداز میں مولانا عبد الماجد کی یہ تحریریں اقبالیات میں ایک منفرد مقام کی حامل ہیں۔ اقبال کے طالب علم اور مولانا عبد الماجد کے مدّاح دونوں یقیناً اِس کا استقبال کریں گے۔

اِس مواد کی فراہمی میں مولانا حکیم عبد القوی صاحب مدیرِ صِدق، کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ اِس اخلاص اور علمی اعانت کے لیئے اِدارہ ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے۔

اِدارہ

مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب

معتمد اسٹڈی سرکل کُل ہند مجلس تعمیرِ ملت کے نام [1]

بسم اللہ

مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۵۷ء
۲۸ رمضان المبارک ۷۷ھ ۱۳

صدق
دریاباد ضلع بارہ بنکی

پیام

حضرت اقبال مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور سارے ملک کے لئے عموماً ایک گنج بے بہا تھے۔ اگر ملک و ملت نے اُن کے پیام بیداری اور خود آگاہی کو سُن لیا اور سمجھ لیا ہوتا، تو کہنا ہی کیا تھا۔ اب خیر اتنا ہی غنیمت ہے کہ ان کا پیام دُہرایا جاتا، اور ان کی یاد منائی جاتی رہے۔

جس "خودی" کو انھوں نے بار بار اُبھارا ہے، اُسی کا نام مذہب کی زبان میں عبدیت یا رُوحانی خودداری ہے اور جس نے اس پیام کو سمجھ لیا، اُس نے اقبال کو سب کچھ سمجھ لیا۔

مبارک ہے آپ کی انجمن کہ اقبال فہمی کا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔

عبدالماجد

[1] ۱۹۵۷ء میں کُل ہند پیمانے پر حیدرآباد میں یوم اقبال کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ اس موقع پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہ پیام روانہ کیا تھا۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد کی تشکیل میں یہ تقاریب اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔

اقبال

سنہ ۱۸۷۳ء — سنہ ۱۹۳۸ء

اقبال سے واقفیت اُس وقت ہوئی جب میں اسکول کے کسی نیچے درجہ میں پڑھتا تھا غالباً سنہ ۱۹۰۳ء میں اور اقبال اس وقت تک سند ڈاکٹریٹ سے سرفراز نہیں ہوئے تھے لیکن فلسفہ میں شہرت پائے ہوئے تھے۔ شہرت ان کے نام کو اس وقت بھی اچھی بھلی شاعری میں حاصل ہو چکی تھی اور حسرت موہانی کے ماہ نامہ اردوئے معلیٰ میں ------- ان کی غزلوں پر کبھی کبھی تنقید چھپی کرتی تھی اور وہ بھی زیادہ تر زبان کے اعتبار و معیار سے بچپن کا زمانہ بھی کسی درجہ جہالت و نادانی کا ہوتا ہے وہ تنقیدیں بڑے شوق سے پڑھ کر یاد کر لیتا تھا اور ناواقفوں کے سامنے بڑے فخر و پندار سے انھیں اپنی جانب منسوب کر کے اقبال پر اعتراض کیا کرتا تھا گویا میں اتنا بڑا نقاد و سخن فہم ہوں کہ اقبال تک کو خاطر میں نہیں لاتا اور ان کی دھجیاں اڑا دیتا ہوں۔

جب سن اور آیا، اُردو شعر سمجھنے کی تھوڑی بہت تمیز آچلی (وہ بھی زیادہ تر مولانا شبلی اور حضرت اکبر الٰہ آبادی کے فیض صحبت سے) تو اپنی اس طفلانہ عادت پر خود بڑی نفرین کی اور اقبال کا کلام بڑے لطف و عقیدت سے پڑھنے لگا۔ خصوصاً ان کی فارسی مثنویاں اسرار خودی رموز بے خودی، اودھ پنچ (لکھنو) میں اب بھی ان پر سخت گروہ گیریاں چھپتی رہیں۔ لیکن اب انہیں خرافات کے درجہ میں سمجھنے لگا۔ اقبال کا ترانہ ملی اب گراموفون میں بھر لیا گیا تھا اور بعض خوش آوازوں کے گلے سے اس کے سننے کا اتفاق ہونے لگا تھا۔ محمد علی ان نظموں سے بڑے ہی متاثر تھے اور ان کے تاثر سے حصہ میں بے علم و بے ذوق بھی پورا لینے لگا تھا۔ ضرب کلیم

پیامِ مشرق، بالِ جبریل، جاوید نامہ ایک کے بعد دوسری شائع ہوتی رہیں، ایک ایک چیز شوق سے منگا کر بڑی بے قراری سے پڑھی۔ بعض پر خوب رویا بھی، اور بعض پر دل کٹ کر رہ گیا۔ فارسی کلام میں مولانا روم کی مثنوی میرے لئے ایک شمعِ ہدایت تھی۔ اس سے کچھ ایسا کم مرتبہ اقبال کی بھی مثنویوں و نظموں کا نہ رہا۔ ایک دور میرے اوپر کئی سال کا قوالی اور سماع کا بھی رہا۔ کلامِ اقبال کے اچھے خاصے ٹکڑے اپنے قوال کو بھی یاد کرا دیئے تھے اور جب جی چاہتا اپنے قوال سے اُن کو سُنا کرتا۔

ملاقات ایک بار لکھنؤ میں تو ۱۲ء میں بالکل سرسری، اقبال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں آئے تھے میں اپنے شرمیلے پن سے نہ کچھ آگے بڑھ نہ سکا نہ کچھ زیادہ استفادہ کرسکا۔ پھر شاید ۱۹۲۰ء میں اُن سے ملاقات حیدرآباد میں ہوئی وہ مدراس سے اپنے انگریزی لکچر دے کر واپس ہو رہے تھے، اور میرا جانا حسنِ اتفاق سے اس وقت حیدرآباد کا ہو گیا۔ ایک سے زائد ملاقاتیں رہیں اور اس کے بعد مراسلت کا سلسلہ ان کی وفات کے وقت تک جاری رہا۔ حضرت اکبر کو اقبال نے اپنے خط میں (میرے نشہ فلسفیت کے زمانہ میں) لکھا "کہ آپ کے ماجد صاحب تو برگسان کی جیب میں رہتے ہیں"۔ حضرت اکبر نے جواب دیا کہ انشاء اللہ وہ وقت آئے گا جب برگسان ماجد صاحب کی جیب میں رہا کرے گا" اللہ ان دونوں بزرگوں کے مرتبے بڑھائے کیسا کیسا اپنے چھوٹوں کو بڑھاتے تھے۔

اقبال دینی اور اسلامی شاعر شروع ہی سے تھے سن کے ساتھ یہ رنگ پختہ سے پختہ تر شوخ سے شوخ تر ہوتا گیا۔ بعض نظمیں تو سو فیصدی سوزِ جگر کی ترجمان ہیں۔ البتہ اقبال کی نثر خصوصاً انگریزی نثر میں جہاں انھوں نے جدید فلسفہ کی شرح و ترجمانی کی ہے وہ اسلامی رنگ سے بار بار ہٹ ہٹ گئے ہیں۔ اقبال میں رندی شروع میں پائی جاتی تھی رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی گئی اور وہ توبہ و انابت کے خوگر ہوتے گئے پیشے کے لحاظ سے بیرسٹر تھے لیکن طبیعت و مزاج کے لحاظ سے اس کام کے کچھ زیادہ اہل نہ تھے، محمد علی بھی ولایت پلٹ ہوکر ٹھیٹھ مسلمان بنتے رہے اور وفاقِ اسلامی کے قیام کے داعی۔ محمد علی کے بعد شاید سب سے بڑے یہی تھے۔ وطنیت و وطن پرستی کے دربارِ مذمت میں ان کی متعدد نظمیں یادگار بن گئی ہیں قیامِ پاکستان ایک بڑی حد تک انہیں کی تخلیقِ فکری کا نتیجہ تھا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک کے قطعِ منصبِ خلافت کو انھوں نے محمد علی ہی کی طرح کبھی معاف نہیں کیا۔ تھا۔

پیام اقبال

ورنگل (دکن) کے جواں ہمت بوڑھوں اور جوانوں نے مل کر، پچھلے ماہ یوم اقبال دھوم دھام سے منایا۔ تقریب کے موقع پر پیام، مدیر صدق سے بھی طلب ہوا تھا۔ الفاظ ذیل میں بھیج دیا گیا اور یہی جلسہ میں سنا دیا گیا۔

"جس کی شاعری اول سے آخر تک ایک پیام ہی تھی اس کی یادگار کے موقع پر پیام کوئی دو چار لفظوں کا کیا بھیجے! اقبال پر اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں کہ اسے شاعر یا فلسفی یا کچھ اور قرار دیا جائے۔ وہ تمام تر "پیامبر" تھا۔ حقیقی اور اصلاحی پیغمبر کا جانشین اور خادم۔ ساری زندگی گزار دی شرح و ترجمانی میں اسی لاہوتی پیام کے، ناسوتیوں کی زبان میں نئے نئے رنگ سے نئے نئے ڈھنگ سے، حکیمانہ عنوان سے، ادیبانہ شان سے"۔

۲۰ مئی ۱۹۷۰ء

شکوہ اور جوابِ شکوہ

جو زبان خوگر تھی حمد وثنا، شکر ومناجات کی وہ آخر ایک بار گلہ وشکوہ پر کھلی۔ یا یوں کہیے کہ کھلوائی گئی۔ آقا کا کرم جب خود ناز برداری پر آمادہ ہو جائے تو کون بندہ ہے جو نیاز کے فرش زمین کو چھوڑ کر ناز کی فضا میں اُڑنے نہ لگے۔ عبدیت کی دنیا میں سنتے ہیں گریہ یعقوبیؑ کے ساتھ ساتھ ایک منزل تبسم سلیمانیؑ کی بھی تو آتی ہے۔

اقبال کے شکوہ میں (شاعر اس وقت تک شاعر اسلام بن چکا تھا) بندہ اپنے خالق سے گویا روٹھ کر کہتا ہے کہ واہ بیگانوں پر، باغیوں پر، سرکشوں پر تو لطف ونوازش کی یہ بارشیں اور ہم اہل توحید کی یہ حالت زار۔ کیا یہی ہماری وفاکیشی کا صلہ ہے۔ یہی ہماری توحید پرستی کا انعام ہے۔

کونسی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی — اور تیرے لئے زحمت کش پیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی — کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی

لیکن "شکوہ" کا نام ہی شکوہ ہے۔ مضمون وہی حمد ومناجات کا اس لفافہ کے اندر بھی موجود ہے ہر طنز میں عبدیت کی چاشنی، ہر گلہ میں توحید پرستی کی شیرینی۔

اقبال کی اردو شاعری کی شہرت وعظمت کی اصل بنیاد یہی شکوہ ہے۔ خوب چلا، خوب پھیلا جو کچھ بھی نہ سمجھے انھوں نے بھی مزے لے لے کر پڑھا اور جو مطلب الٹا سمجھے انہیں تو گویا اپنی آزاد

لے دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۲۱ اپریل سنہ۱۹۴۳ء کو وقت ۵ منٹ (بسلسلہ یوم اقبال)

خیالی کے لئے ایک سند و دستاویز ہاتھ آگئی۔

حکیم ملت کہ ملت کا نباض تھا قوم کے رگ و ریشہ سے واقف تھا، بھانپ گیا۔ جو آبِ حیات کا قطرہ تھا وہ مشیٹوں اور گلدستوں تک پہنچتے پہنچتے زہر کی بوند بن گیا۔ مقابلتاً اور شکوہ کے جواب میں "جواب شکوہ" کہہ ڈالا۔ جوش و خروش وہی زورِ بیان وہی۔ البتہ حقائق، زائد حقیقتوں کی کھلی ہوئی اور صداقتوں کا اظہار فاش و برملا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ وعدے تو مسلموں اور پرستارانِ توحید کے لئے تھے۔ تم مسلم اور موحد ہو کب؟ نظر فال پر نہیں اپنے حال پر کرو، اپنے اعمال پر کرو۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو — پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو؟
حیدری فقر ہے نے دولت عثمانی ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے

عوام اپنے جذبات کی ترجمانی "شکوہ" میں زیادہ پاتے ہیں اس لئے پست مذاق طبقہ آج تک "شکوہ" پسند ہی چلا آرہا ہے۔ حالانکہ "جواب شکوہ" کی سطح "شکوہ" سے کہیں بلند ہے۔ "شکوہ" والا اقبال ایک صاحب حال سالک ہے "جواب شکوہ" والا اقبال ایک صاحب مقام عارف ہے۔ پہلے کے قدم اقلیم قلب کی وادیوں میں، دوسرے کی نگاہ فضائے روح کی بلندیوں میں۔

جنونِ الحاد

اقبال کے شکوہ و جواب شکوہ پر ایک ملحد کے تبصرہ کا اقتباس :-

"شکوہ میں شاعر نے مسلمانوں کی طرف سے خدا کو مخاطب کیا ہے اور گذشتہ اسلامی کارناموں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ جواب شکوہ میں خدا نے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے ان دونوں صورتوں میں وہ ساری ذہنیت کارفرما ہے جس کے زیر اثر کچھ قومیں اپنے خدا کی منتخب قوم تصور کرتی ہیں۔ ان نظموں کی فکریات سے اب دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ اقبال کی ان نظموں میں جنونِ مظلومیت کارفرما ہے۔ دنیا بھر کا ایک مذہبی اعتقاد اور دنیا بھر کی ایک مذہبی اہمیت بہت ضرر رساں خیالات ہیں۔ اقبال ایک مہذب اور متمدن دنیا کے SETTING میں اسلامی دنیا کو پیش نہ کر سکے"

(آواز - ۲۲ جولائی ۱۹۴۳ء صا)

مضمون کے اندر لفظ "جنون" (MANIA) خوب مل گیا۔ ایسے ہذیانات کے لئے عنوان تلاش کے بعد بھی اس سے بلیغ تر اور کون سا ہو سکتا تھا؟

اب پہلا سوال یہ ہے کہ اگر اسی کا نام "ادبی تنقید" ہے تو خدا معلوم مذہبی دخل در معقولات کا اطلاق کس کس چیز پر ہو گا؟ ریڈیو والوں کو اصرار شد و مد کے ساتھ رہا ہے کہ اور جو کچھ بھی ہے لیکن مائیکروفون کو مذہبی پروپگنڈے کے لئے بہرحال استعمال نہیں کیا جا سکتا لیکن اس دعوے کے اندر حقیقت صرف اتنی ہے کہ مذہب کی تائید و حمایت میں تو بے شک کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن

مذہب کی مخالفت میں ہر بکواس کی ہر ہرزہ سرائی کی اجازت ہے۔
پروپگنڈہ اگر مذہب کا جرم ہے تو لامذہبی والحاد کا اس سے بڑھ کر ہونا چاہیئے۔

پھر ارشاد ہوا کہ شکوہ اور جواب شکوہ دونوں میں وہ ساری ذہنیت کارفرما ہے جس کے زیر اثر کچھ قومیں اپنے کو خدا کی منتخب قوم تصور کرتی ہیں"۔

لیکن یہ قومی برتری ونسلی تفوق کا تخیل "سامی" ہے۔ تحقیق کی عدالت سے تو یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ تخیل خالص "آریائی" ہے" ہندی" ہے" برہمنی" ہے۔ حیرت ہے کہ ملحد نے اپنے وطن (دیش بھومی) کو چھوڑ کر عرب وشام تک جانے کی زحمت گوارا کیوں کی؟ ـــــ اور پھر یہود کا حال جو کچھ بھی ہو، مسلمانوں نے "قومی تفوق" یا نسلی برتری کا دعویٰ کس دن کیا ہے؟ شکوہ جواب شکوہ دونوں کے کس شعر، کس مصرعہ، کس لفظ میں اس خیال کی ترجمانی ہے؟ اسلام تو اصلاً ہی اس کا منکر ہے کہ ذات پات قوم قبیلہ، نسل وخاندان کو معیار فضیلت قرار دیا جائے۔ قرآن وحدیث دونوں نے صرف اسی عقیدۂ جاہلی پہ بار بار لگائی ہے۔ اس کے لئے اس کی حوصلہ افزائی کسی درجہ میں بھی، ممکن ہی کیونکر ہے؟ اس کی جانب ایسی بے حقیقت بات منسوب کرنا صرف اسی کا کام ہو سکتا ہے جو دین کی طرح دیانت سے بھی بے نیاز ہو چکا ہے۔ اسلام کا تو خود ہی یہ دعویٰ ہے کہ اصل چیز صرف تصحیح فکر ونظر ہے یعنی ایمان اور پھر تصحیح عمل۔ اس کے سوا جو بھی معیار ہے باطل ہے۔ کیا دنیا، مہذب دنیا، سوشلسٹ دنیا،" فکریات" "IDEALOGY" اس سے بہت آگے جا چکی ہے"۔ اس کے ٹھیک برعکس گھوم پھر کر ہار کر اور تھک کر الٹی اسی مرکز کی طرف سمٹ سمٹا کر آرہی ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ اس بیکر عقل کو سرے سے فرق ہی ایک " مذہبی امت" (فکر وعقیدہ اختیاری کی بنا پر منظم ہونے والی جماعت) اور ایک قوم ونسل (محض محبت واتفاق سے پیدا کئے ہوئے غیر اختیاری نقطۂ وحدت کی بنیاد پر یکجا ہو جانے والے گروہ) کے درمیان نظر نہیں آتا؟۔

مغرب کی ترقی کا راز

قوت مغرب نہ از چنگ و رُباب — نے ز رقص دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحران لالہ روست — نے ز عُریاں ساق و نے از قطع مو ست
محکمی اُو را نہ از لادینی ست — نے فروغش از خط لاطینی ست
قوت افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است

اچھے بُرے کا سوال الگ ہے۔ لیکن نفس قوت، غلبہ و اقتدار تو بہر حال مغرب کو حاصل ہی ہے۔ حضرت اقبال فرماتے ہیں کہ قوت اسے کہاں سے حاصل ہوئی ہے؟ کیا گانے بجانے سے؟ کیا بے حجاب عورتوں کے رقص سے؟ کیا عورت کے نیم عریاں لباس، یا کٹے ہوئے بالوں کے فیشن سے؟ کیا اس کی لادینی حکومت سے؟ کیا لاطینی رسم الخط سے؟ اور پھر ان تمام ظاہری اور نمائشی چیزوں کی نفی کر کے فرماتے ہیں کہ

قوتِ افرنگ از علم و فن ست — از ہمیں آتش چراغش روشن ست

فرنگ نے جو قوت حاصل کی ہے اور جس کے زور سے وہ آج دنیا کو اپنے تابع فرماں کئے ہوئے ہے، وہ علوم و فنون کا ثمرہ ہے۔ اس کا چراغ جو سارے عالم کو روشن کئے ہوئے ہے وہ آخر علم و فن ہی کی آگ سے تو جل رہا ہے ـــ تو حضرت اقبال کا فرمانا یہ ہے کہ ہم پر کیسا شامت سوار ہے کہ فرنگیوں سے ہم لیتے بھی ہیں تو صرف ان کی بے حیائی اور بے دینی اور کیکر

مطبوعہ صدق جدید - بابتہ ۱۰ فروری ۱۹۵۶ء

چھوڑے رہتے ہیں ان کی علمی ترقیوں اور ذہنی کاوشوں کو۔ صدہا ایجادات اور سینکڑوں انکشافات ہر سال ہوتے رہتے ہیں لیکن ان میں نام کسی مسلمان کا بھی نہیں آتا۔ نہ ہندوستان کے نہ پاکستان کے، نہ مصر کے، نہ ایران کے، نہ ترکی کے نہ انڈونیشیا کے! طبعیات، ریاضیات، ارضیات، نباتات، حیوانات، فلکیات، جغرافی تحقیقات، معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں سے کوئی واسطہ ہی ہم کو نہیں! کمال جب بھی حاصل کریں گے اور نام جب بھی پیدا کریں گے تو بس یا ناول نگاری میں یا فلم ایکٹری میں! حُبِ دنیا کی اجازت اسلام یقیناً نہیں دیتا بلکہ اسے جرم ٹھیراتا ہے۔ لیکن آخر تسخیر قوائے کائنات سے کس نے ہم کو روکا ہے؟ برق و مقناطیس کے خواص و تاثرات کے علم سے کون باز رکھے ہوئے ہے؟ کیا تعلق مع اللہ و تبتل کے معنی حقائق تکوینی و طبعی کی طرف سے یکسر آنکھ بند کر لینے کے ہیں؟

شیشہ اور موتی

اسی چودھویں صدی ہجری کا ایک محقق عالم، جس پر فلسفہ کے بعد نبوت کی حقیقت بھی منکشف ہو چکی تھی، اپنے ہم عصروں کو سمجھاتا ہے ؎

فلسفی را از پیمبر وا شناس　　آبگینہ را ز گوہر وا شناس

فلسفی اور پیمبر کے درمیان، شیشہ اور موتی کے درمیان فرق کرنا سیکھو۔ شیشے کی جگمگاہٹ کی قدر اسی وقت تک ہے جب تک ہیرے اور جواہر نظر سے نہیں گزرے ہیں۔ لعل و گوہر کی آب و تاب جس وقت آنکھوں کو خیرہ کرنے لگے گی، کانچ کا ٹکڑا خود ہی نگاہوں سے گر کر رہے گا۔

آبگینہ راز پنداری بدست　　جز دمیکہ گوہرے آری بدست

چوں گہر آمد بہ دستت شبچراغ　　آبگینہ شد سیہ چوں پر زاغ

افلاطون و ارسطو ہوں یا ہگل و اسپنسر، ان بیچاروں کی بساط تو بس اتنی ہی ہے کہ گویا کوئی شخص ایک گہرے کنوئیں کے اندر پڑا ہو، وہاں سے زینہ لگا کر آفتاب تک اچک جانے کا منصوبہ باندھتا ہے ممکن ہے سیڑھی کے دو چار دس یا پانچ ڈنڈے چڑھ جائے۔ لیکن نتیجہ؟ نتیجہ یہی کہ بس پھر اوپر سے سر کے بل گرے گا اور اوندھے منہ کنوئیں کی تہہ میں جا پڑے گا۔

فلسفی اندر بن چاہ نژند　　نردباں دارد بہ خورشید بلند

نردبانش می برد تا چند رش　　پس بچاہ افتد نگوں گشتہ سرش

---

۱ مطبوعہ سچ، بابتہ ۲۵ نومبر ۱۹۳۲ء

ابراہیم خلیلؑ، موسیٰ کلیمؑ اور خاتمؑ الانبیا کا طریقہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ انہیں نیچے سے اوپر جانے کی فکر اور تدبیر کی ضرورت نہیں۔ ان کا مقام خود ہی بلند سے بلند تر ہوتا ہے، اور ان آسمانی بلندیوں سے وہ خود کمند پھینک پھینک کر دوسروں کو ان کی بلندیوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ جس نے ان کی کمند کو مضبوط پکڑ لیا بس وہ خوش نصیب بام آفتاب تک پہنچ گیا ۔

واں پیمبر خود ز بام آسمان ۔۔۔ رشتۂ افگندہ سوئے خاکیاں
رشتۂ جاں را بدیں رشتہ بتاب ۔۔۔ پس بر آ، تا بارگاہِ آفتاب

علوی اور سفلی کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟ خاک اور عالم پاک ایک مرتبہ پر آسکتے ہیں؟ پستی اور بلندی کا ایک درجہ ہو سکتا ہے؟

ز آسماں پیغمبر آوازے دہد ۔۔۔ فلسفی از خاک پروانہ دہد
ایں ز دوری رہ نماید سوئے خاں ۔۔۔ واں بخواند خود تراز کوئے جاں

روشنی اور تاریکی، زندگی اور ہلاکت، فلاح و نامرادی دونوں کی راہیں ہمارے آپ کے سامنے کھلی ہوئی ہیں اور انتخاب میں آپ بالکل آزاد ہیں ۔ شاباش وہ جو سیدھی راہ پر پڑ لیے، حیف ان پر جو بھٹک کر رہ گئے ۔

▲ ▲ ▲

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق

اقبال کی ایک تازہ اور کسی قدر قدیم، دو فارسی مثنویوں کا مجموعہ ہے اور اقبال کے کلام کی مدح و توصیف میں اب کچھ کہنا شاعر کی داد سے زیادہ خود اپنی سخن فہمی کا اعلان کرنا ہے اور اپنی جوہر شناسی کا اشتہار دینا ہے۔ آفتاب کے روشن ہونے کی اگر آپ شہادت دے رہے ہیں تو یہ ثبوت تو آفتاب کی روشنی سے بڑھکر خود آپ کی بصارت کے صحیح و تندرست ہونے کے حق میں ہوا۔ حضرت رومی رح

مادح خورشید مداح خود است   کیں دو چشمم روشن و نامہ بدست

کتاب کا موضوع، عنوان سے ظاہر ہے — اور ایک ہی موضوع تو لے دے کے اب اقبال کے پاس رہ گیا ہے۔ پرانے ہوتے پر ہمیشہ نیا! کثرتِ تکرار کے باوجود ہر دم تازہ و شگفتہ! "عشق" گننے میں ایک، "کیفیاتِ عشق ہر دم تجدید، لذاتِ عشق، ہر لحظہ مزید!

زبان فارسی، لیکن اتنی سلیس کہ گویا اچھے پڑھے لکھوں کی اردو۔ کوئی ذرا سا بھی مشکل یا نامانوس لفظ اگر آ گیا تو اس کا حل وہیں حاشیہ میں موجود شروع میں پڑھنے والے سے فرماتے ہیں کہ ہوش و خرد نے حرم میں بغاوت برپا کر رکھی تھی میں اس کے لئے دیار عشق سے لشکر جرار لے کر آرہا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ عقل کے لئے یوم الحساب ہے ہی نہیں۔

نگاہ بندۂ مومن قیامت فرداست!

تمہید کا آغاز جس نام نامی سے ہوتا ہے اس سے دنیائے عشق میں کون ناواقف ہے؟

پیر رومی مرشد روشن ضمیر — کاروان عشق و مستی را امیر
نور قرآں درمیان سینہ اش — جام جم شرمندہ از آئینہ اش

ان کی روحانیت مکشوف ہو کر اقبال سے کہتی ہے ؎

جز تو اے دانائے اسرار فرنگ — کس نکو ننشست در نار فرنگ
باش مانند خلیل اللہ مست — ہر کہن بتخانہ را باید شکست
عصر تو از رمز جاں آگاہ نیست — دین او جز حب غیر اللہ نیست
سر شبیری را نہ فہمد گاؤ میش — جز بہ شیراں کم بگو اسرار خویش
با حریف سفلہ نتواں خورد مے — گرچہ باشد پادشاہ روم و رے
یوسف ما را اگر گرگے برد — بہ کہ مردے ناکسے او را خرد
معنی دین و سیاست باز گوئے — اہل حق را زیں دو حکمت باز گوئے

ساری مثنوی اسی پیام کی شرح و تفصیل میں ہے۔ "حکمت کلیمی" و "حکمت فرعونی" کے بعد ایک عنوان لا الہ الا اللہ ہے۔ اس کے تحت میں فرماتے ہیں کہ لاجلال ہے۔ الا جمال، لا نفی، الا ثبات، لا تیغ، الا ہستی۔ سارا نظام کائنات انھیں دو حرفوں کی قوت عمل کا تماشہ گاہ ہے۔ ابتدا لا ہی سے کرنی چاہیئے اور غیر اللہ کے مقابلے میں وظیفۂ حیات اسی کو بنانا چاہیئے۔

نار و تقدیر جہان کاف و نون — حرکت از لا زاید از الا سکون
در جہاں آغاز کار از حرف لاست — ایں نخستیں منزل مرد خداست
پیش غیر اللہ لا گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات

آگے ایام عرب وغیرہ سے گزرتے ہوئے "دور حاضر کے سرمایہ سوز" روس تک پہنچ جاتے ہیں اور ذرا دیکھئے کہ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں ؎

ہمچناں بینی کہ در دور فرنگ — بندگی با خواجگی آید بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرف لا آمد بروں

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطین، لا کلیسا لا الٰہ
فکر ما در تند باد لا بماند — مرکب خود را بسوے الا نراند

انجام جو ہونا ہے ظاہر ہے ؎

آیدش روزے کہ از زورِ جنون — خویش را زیں تند باد آرد بروں

اس لئے کہ

در مقام لا نیاساید حیات — سوے الا می خرامد کائنات

اقبال کے سردار و آقا نے تو یہ فرمایا تھا کہ کل روئے زمیں میرے لئے سجدہ گاہ ہے اور کہاں آج دیکھنا پڑ رہا ہے کہ یہ مسجد اپنوں کی نہیں، بیگانوں کے قبضہ میں ہے ؎

مومناں را گفت آں سلطان دیں — مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں
الاماں از گردشِ نُہ آسماں — مسجد مومن بدست دیگراں!

پیروں کا فقرہ، رہبانیت اور جوگ ہے، مومن کا فقرہ تو عین بادشاہی و حکمرانی ہے ؎

فقر قرآں احتسابِ ہست و بود — نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست؟ تسخیر جہات — بندہ از تاثیر او مولا صفات
فقرِ کافر، خلوتِ دشت و دراست — فقرِ مومن لرزۂ بحر و براست
فقرِ چوں عریاں شود زیرِ سپہر — از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیٔ بدر و حنین — فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ

زمانہ نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اور عصر حاضر سے مقابلہ کے وقت ہم نے کیسی پہلی ہی میں اپنی ہار مان لی ہے، اس کا ایک جلوہ اس آئینہ میں ملاحظہ ہو۔

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد — می شناسی عصرِ ما با ما چہ کرد!
عصرِ ما، ما را زِ ما بیگانہ کرد — از جمال مصطفےٰ بیگانہ کرد
سوزِ او تا از میانِ سینہ رفت — جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
باطنِ ایں عصر را نشناختی — دادِ اول خویش را در باختی

"اقبال ریویو"

تہذیب فرنگ کی مصوری اقبال فدا جانے کتنی بار کر چکے ہیں، لیکن ہر نیا نقش اپنی دل آویزی میں پچھلے نقوش سے کچھ بڑھ کر ہی رہتا ہے۔ ایک طویل نظم کا عنوان وہی ہے جو کتاب کا ہے، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔ اس کے ذیل میں فرماتے ہیں ؎

آدمیت زار نالید از فرنگ / زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد / زیر گردوں رسمِ لادینی نہاد
گرگے اندر پوستینِ برّۂ / ہر زماں اندر کمیں برّہ
دانش افرنگیاں تیغے بدوش / در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش
آہ از افرنگ و از آئینِ او / آہ از اندیشۂ لادینِ او
علمِ حق را ساحری آموختند / ساحری نے کافری آموختند!
اے کہ جاں را باز می دانی ز تن / سحرِ ایں تہذیبِ لادینی شکن

ردِ بلا تو مومن کے ہاتھ میں ہے۔ مومن اگر اپنے ایمان پر جم جائے، اور اپنی خودداری پر ثابت قدم رہ جائے تو سارا طلسم آناً فاناً ٹوٹ کر رہتا ہے۔

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ / تا کجا در قیدِ زُنّارِ فرنگ
زخم ازو نشتر ازو سوزن ازو / ما و جوئے خون و امیدِ رفو
خود بدانی پادشاہی قاہری است / قاہری در عصرِ ما سوداگری است
تختۂ دکّاں شریکِ تخت و تاج / از تجارت نفع و از شاہی خراج
کشتنِ بے حرب و ضرب آئینِ اوست / مرگہا در گردشِ ماشینِ اوست
بے نیاز از کارگاہِ او گذر / در زمستاں پوستینِ او مخر
ہوشمندے از خمِ او مے نخورد / ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مُرد
وقتِ سودا خند خند و کم خروش / ما چو طفلانیم و او شکر فروش

اقتباسات بہت ہو گئے۔ جبر کر کے قلم روکنا پڑتا ہے ورنہ اگر طبیعت پہ چھوڑ دیا جائے تو شاید ساری کتاب ہی اول سے آخر تک نقل ہو کر رہے۔" اللہ مست" مولا صفات۔

"خود گداز" اور اسی قسم کی دوسری حسین ترکیبیں تو اقبال کا حصہ ہو چکی ہیں اور ان پر کچھ کہنا تحصیل لاحاصل ہے۔

دوسری مثنوی "مسافر" کے نام سے ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں تھوڑی ہی تعداد میں نکلا تھا۔ اس لئے زیادہ پھیل نہ سکا۔ دنیا کے لئے کہنا چاہیئے کہ یہ مثنوی بھی نئی ہی ہے۔ اقبال نادر شاہ شہید کی دعوت پر، مع مولانا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود، ۳۳ء میں کابل گئے تھے واپسی پر اپنے تاثرات اس مثنوی میں جمع کر دیئے ہیں، اور جو کچھ بھی کہنے کے قابل باتیں تھیں سب کہہ ڈالیں۔ نادر کون؟ مدح و وصف کے شعر بہت سے سنے ہوں گے، ذرا تعارف نامہ کا ایک شعر اقبال کی زبان سے سنیئے ؎

خسروی شمشیر و درویشی نگہ ہر دو گوہر از محیطِ لاالٰہ

اسی سفر میں اقبال شہنشاہ بابر کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں اور کیسے رنگ و بو کا گلِ عقیدت مزار پر چڑھاتے ہیں۔

خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرمید این جا کہ این زمیں ز طلسمِ فرنگ آزاد است

غزنی میں حکیم سنائی کی قبر پر جا کر مراقب ہوتے ہیں اور بہشت بریں سے صدا سنتے ہیں ؎

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

مزار سلطان محمود پر جو گزری، ویرانہ غزنی میں مناجات پڑھنے والے نے کیا دیکھا اور کیا سنا اور کیا کہا اور اس قسم کے سارے دلکش منظر کے لئے تو اصل کتاب کو ملاحظہ فرمائیے اور آخر میں صرف اتنا اور سن لیجئے کہ اقبال کو شاہ شہید کی اقتدا میں نماز عصر پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ آہ! کہاں وہ ایک نماز شاہ اسلام کے پیچھے اور کہاں دوسری صدہا نمازیں! شاعر اگر ان مقامات کی شرح کرنا چاہیئے بھی تو بیان پر قدرت کہاں لا سکتا ہے۔ مجبوراً بس اتنی سی کسک دل میں پیدا کر کے رہ جاتا ہے ؎

راز ہائے آں قیام و آں سجود جز بہ بزمِ محرماں نتواں کشود!

"ضربِ کلیم"

اقبال، مسلمانوں کی قوم کے کلیم، اقبال کا سن جوں جوں پختگی کی طرف بڑھتا جاتا ہے، حکمت و شاعری پختہ سے پختہ تر ہوتی جا رہی ہے ـــ خام تو کبھی بھی نہ تھی۔ شاعری سے مراد کبھی غزل گوئی اور قافیہ پیمائی نہیں۔ مراد وہ شاعری ہے جو روتی کی تھی سناتی کی تھی وہ شاعری نہیں جو حق سے ہٹاتی، بھگاتی ہے۔ وہ شاعری ہے جو حق کی طرف بلاتی، لاتی ہے۔

اقبال کا پیام ساری دنیا کے لئے ہے، دنیائے اسلام کے لئے خصوصاً۔ قرآن کی بھی مخاطب ساری نوع انسانی ہے لیکن حقیقتہً فائدہ اٹھانے والے صرف مومنین ہیں۔ اقبال اپنا درد دل سنانا تو سب ہی کو چاہتے ہیں، جو پہلے اقبال کے خدا کی؟ اقبال کے رسول ؐ کی سن چکے ہیں۔ ان فی ذالک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شہید۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کچھ فارسی میں کہہ چکے ہیں بہت کچھ اردو میں کہہ رہے ہیں۔ تازہ ترین افادہ کا نام "ضربِ کلیم" ہے۔ زبان اردو، ضخامت ۱۸۲ صفحات۔ طباعت صاف و روشن، قیمت درج نہیں۔ جو کچھ بھی ہو ـــ بہر حال کتاب کی معنویت کے اعتبار سے کمتر ہی ہوگی۔ عصائے موسیٰؑ کی قیمت کا اندازہ کوئی صاحب یوں بھی فرمائیں گے کہ اتنے فٹ لمبی اور اتنے اینچ موٹی۔ جنگل کی لکڑی کا مول تول بازار میں کیا ہے۔ ملنے کا پتہ "طلوع اسلام" میکلوڈ روڈ، لاہور۔ بعض صحابہؓ نے دریافت کیا کہ امت میں کس زمانہ کے لوگ بہتر ہوں گے۔ جواب میں سرور سردار ؐ کی زبان سے ارشاد ہو کہ میری

امت کی مثال تو بارش کے قطروں کی سی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اگلے قطرے بہتر رہے یا پچھلے۔ اقبال کا کلام بھی مسلسل بارانِ رحمت سے کم نہیں۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ بہتر کسے کہیئے اور کسے نہ کہیئے اور اگر کسی کو اعلیٰ و بلند ٹھیرا بھی لیجئے تو اس کے مقابل میں آخر ادنیٰ و پست کسے ٹھیرائیے۔ جب کلام سامنے آگیا دل نے کہا یہی خوب اور خوب تر ہے۔ جب کسی دوسرے کلام پر نظر پڑی تو اب قوتِ فیصلہ مغلوب، نگاہِ انتخاب حیران! یہ اور بات ہے کہ انتخاب کی حیثیتیں ہی شروع سے مختلف ٹھیرا لیجئے اور اسی لحاظ سے فیصلہ کر دیجئے کہ شوخی و برجستگی فلاں میں زیادہ ہے، عمق میں فلاں بڑھا ہوا ہے، درد و گداز میں فلاں کا نمبر اول ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔

ضربِ کلیم کا وصف امتیازی، حکیمانہ ژرف نگاہی ہے۔ ہر عنوان دقتِ نظر کا ایک مرقع ہر صفحہ نکتہ سنجیوں کا ایک گلدستہ، بات وہی ایک ساڑھے تیرہ سو برس کی پرانی بلکہ اس سے بھی ہزاروں سال قبل کی بات کہنے کے ڈھنگ نئے نئے اور عنوانات جدا جدا۔ بات میں کشش ایک تو ہر فطرتِ سلیم والے کے لئے ذاتی موجود اور پھر کہنے والے کی زبان میں موہنی ــ کتاب قدرۃً دلچسپ اسی قدر ہو گی کہ ایک بار شروع کر کے ختم کرنے کو جی نہ چاہے، اور پڑھتے پڑھتے جب آخری صفحہ پر پہنچے تو دل میں حسرت ہی رہ جائے کہ محفل برخاست اتنی جلدی کیوں ہو گئی! وہی رونے گل کے سیر ہو کر نہ دیکھنے اور موسم بہار کے ختم ہو جانے کا پرانا دکھڑا۔

گھر کے بھید، گھر کے بھیدی سے بڑھ کر کس کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔ بتکدۂ آذر پر تیشۂ ابراہیمی سے بڑھ کر کس کی ضرب پڑ سکتی ہے۔ طلسمِ افرنگ کو توڑنے کے لئے افسوں خواں اقبال سے بڑھ کر کون ملے گا۔ اُسی طلسم کدہ کا پروردہ اُسی میکدہ کا سرشار ؎

مدتے محوِ تگ و دو بودہ ام — رازدانِ دانشِ نو بودہ ام

باغباناں امتحانم کردہ اند — محرمِ ایں گلستانم کردہ اند

مدتے با لالہ رویاں ساختم — عشق با مرغولہ مویاں باختم

کوئی صفحہ کہیں سے کھول لیجئے، ایک ہی چمن کی گلکاریاں نظر آئیں گی۔ قوت اگر بے دینوں کے ہاتھ میں ہے تو دنیا کے نمونۂ جہنم بنا دینے کے لئے کافی ہے وہی قوت اگر حق پرستوں کے ہاتھ

یں ہے تو حیثیت کی دہبر ہے

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں | سو بار ہوئی حضرت انسان کی قبا چاک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے | عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر | ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

صـ ۲۲

شیخ جدید کا فتوٰی کہ اب جہاد بالسیف کو منسوخ سمجھو اب تو صرف قلم کا فی ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ جہاد سیفی کی منسوخی کے اعلان کا بھلا اس وقت کے مسلمانوں کے سامنے کیا محل ہے!

تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہیں کہاں | ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر

صـ ۲۲

اور ہاں یہ ـــ دل پکڑ سنیے

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل | کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر

اب تو

تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی | دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے | یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

اب دوسرے مصرعہ "یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر" کو مکرر پڑھے بغیر، اس سے لطف لئے بغیر آگے بڑھ جانا ہی ظلم ہے۔ ظلم شاعر پر نہیں خود پڑھنے والے کے ذوقِ سلیم پر

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے | مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات | اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگذر!

جس لفظی طلسم بندی کا نام یونان نے کبھی اور یورپ نے آج بھی فلسفہ رکھا ہے، کہتے ہیں کہ وہ نوجوانوں کے دلوں میں مذہب کی بنیادیں ہلا ڈالتا ہے اس کی حقیقت کوئی اس کے دل سے پوچھے جو خود ان گلیوں کی خوب خاک چھانے پڑا ہو۔ شاعر آج بھی چند سال ادھر تو آخر جوان تھا اور انہیں ڈگریوں اور امتحانوں اور پروفیسروں کی بھول بھلیاں میں ٹھوکریں کھا چکا ہے ـــ

معلوم نہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی ۔۔۔ مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہگزر سے
الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا ۔۔۔ غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار ۔۔۔ جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

صہ ۳۷

ہنگامہ برپا ہے کہ مسلمان زمانہ کا ساتھ نہیں دیتے اس لئے برباد ہوئے جاتے ہیں، مٹے جاتے ہیں حکیم امت کہتا ہے کہ نادانوں ذرا حواس درست کرکے زبان کھولو، مومن کو تم نے پہچانا کیا ہے۔ زمانہ کے آگے سجدہ پرستش میں گر پڑنا یہ کافروں کا شعار ہے۔ مومن کا کام زمانہ کے ساتھ جینا نہیں اسے اپنے ساتھ چلانا ہے، زمانہ کا محکوم بننے کے لئے نہیں، اسی پر حاکم بننے کے لئے آیا ہے

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں ہے گم ۔۔۔ مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

مومن کو فرش خاک کے بسنے والے خاک کے پتلوں نے پہچانا کہاں؟

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ۔۔۔ رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں ۔۔۔ جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن
کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن ۔۔۔ حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

رہا تمدن اسلامی، سو اس کی حقیقت ہر قسم کی جوگیانہ زندگی اور ہر قسم کے اوباشانہ تعیش دونوں سے کہیں مختلف اور بالاتر ہے ؎ صہ ۱۱

نہ اس میں عصر رواں کی حیا سے بیزاری ۔۔۔ نہ اس میں عہد کہن کے فسانہ و افسوں
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال ۔۔۔ عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں

غلامی کی حالت میں گرفتار رہ کر، غلامی پر قانع رہ کر نبوت کی تبلیغ بھی ایک عجیب لطیفہ ہے صاحب الہام، اگر خود آزاد ہے تو دیکھتے دیکھتے انقلاب پیدا کر دیتا ہے ؎

اس مرد خود آگاہ خدا مست کی صحبت ۔۔۔ دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے ۔۔۔ غارتگر اقوام ہے وہ صورت چنگیز!

صہ ۵۹

اب "خود آگاہ" اور "خدا مست" کی ترکیبیں کہیں حکیم مومن خاں دہلوی کے قلم سے نکل گئی ہوتیں تو آج ان کی شہرت میں ان کی نیک نامی میں ان کے کمال فن میں اور چار چاند لگ گئے ہوتے۔ اقبال غریب پنجابی اور سیالکوٹی ہو کر ایسی قسمت کہاں لا سکتا ہے۔ یہی ترکیبیں آج خدا جانے کیسے کیسے نقادانِ فن کو ہفتوں اور مہینوں دعوتِ تمسخر دیتی رہیں گی۔

محمد علیؒ کہا کرتے تھے خدا نے تو انسان کو پیدا کیا تھا یہ حضرتِ انسان ہیں جنھوں نے اقوام کو پیدا کر لیا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ بصیرت ہو تو سوچو، کہاں مکہ کا پیغام اور کہاں جینوا کا اقدام ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام　　پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکہ نے دیا خاکِ جینوا کو یہ پیغام　　جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

اکبر مرحوم فرمایا کرتے تھے "بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو" اطاعت و پابندی تو بڑے سے بڑے ملحد، بڑے سے بڑے متمرد کو بھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر اس دنیا میں ایک لمحہ ایک آن کیلئے بھی چارہ نہیں۔ سوال صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ پابندی کس کی کرنی منظور ہے؟ احکام تشریعی کی یا احکام تکوینی کی؟ پابندی تقدیر کہ پابندی احکام؟ ترجمانِ حقیقت کی زبان سے سنیے اور داد دل ہی دل میں جتنی دیر تک چاہے دیتے رہیے ؎

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر　　ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　　مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

(ص ۶۲)

اپنے ہاں اسکولوں میں کالجوں میں، یونیورسٹیوں میں جس قسم کے نصاب رائج ہیں جو جذبات ان درسگاہوں میں پیدا کئے جاتے ہیں "اعلیٰ تعلیم" کے نام سے جس قسم کا تصور ذہنوں میں جمایا گیا ہے ان سب کا جائزہ لے کر اقبال کی حقیقت نگاری پر نظر کیجئے ؎

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا　　موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے | پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا | ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی | موسیقی و صورت گری و علم نباتات

تہذیب جدید کا ایک خاص مظہر رقص ہے۔ رقص آپ کے ہاں "ارباب نشاط" والا نہیں، مردانہ اور زنانہ طائفوں والا نہیں، بھانڈوں اور بیسواؤں والا نہیں بلکہ وہ ناچ جس میں "صاحب" اور "میم صاحب" مل کر غیروں کے جسم سے جسم ملا ملا کر اور میم صاحب نیم برہنہ طرح طرح تھرکتے ہیں مٹکتے ہیں جب تھکنے لگتے ہیں تو چھلکتے ہوئے جام سے تازہ دم ہو جاتے ہیں اقبال اس منظر کو دیکھ کر اپنے ہم قوموں سے کہتے ہیں ؎

چھوڑ یورپ کیلئے رقص بدن کے خم و پیچ | روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگی کام و دہن | صلہ اِس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

ص ۱۳۵

اکبر نے کہا تھا کہ اگلوں کی تلوار تو جسم ہی کاٹ کر رہتی ہے۔ کمال جدید حربۂ تعلیم کا ہے، کہ قالب وہی رہے اور روح کچھ سے کچھ ہو جائے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا | افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اقبال نے اسی راز کو ایک لارڈ صاحب (لرد) کی زبان سے فاش کیا ہے۔

ایک لرد فرنگی نے کہا اپنے پسر سے | کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو | ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُدھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب | سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے ایک ڈھیر ص ۱۵۶

اقبال کو آپ نے اپنوں کی زبان سے یہ بارہا سنا ہو گا کہ ایک سرکاری آدمی ہیں، عہدہ کے حریص خطاب کے بھوکے "اب ذرا اس حکومت کے آدمی کی زبان سے" ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام سنیئے۔

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں | زناریوں کو دیر کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا | روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات | اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو ▲▲

دانشِ حاضر

دانش حاضر حجاب اکبر است   بت پرست و بت فروش و بت گر است

"دانش حاضر" جس کا نام آپ نے فرط تعظیم و غایت تکریم سے "علوم جدیدہ" رکھا ہے اور جس کے اندر "سارے سائنس" اور "سارے آرٹ" شامل ہیں، اس کی بابت کہنے والا کہتا ہے کہ ان سر تا پا تصنع "علوم" و "فنون" سے بڑھ کر علم حق پر پردہ ڈالنے والا کوئی نہیں، مگر خود یہ کہنے والا کون ہے؟ کوئی مسجد کے حجرہ کے اندر بند رہنے والا کٹھ ملا نہیں، خانقاہ کے اندر چھپ کر رہنے والا صوفی نہیں، کالجوں کے سایہ میں پلا ہوا، یونیورسٹیوں کی گودوں میں کھیلا ہوا، فرنگیوں کی علم و حکمت کی انتہائی سندیں اور ڈگریاں پائے ہوئے، بیسویں صدی کا زندہ حکیم و زندہ شاعر اقبال ہے۔ جو خود اپنے متعلق کہتا ہے اور حرف بہ حرف سچ کہتا ہے ؎

مدتے محو تگ و دو بودہ ام   راز دانِ دانش نو بودہ ام
باغباناں امتحانم کردہ اند   محرم ایں گلستانم کردہ اند
گلستانے لالہ زارے عبرتے   چوں گل کاغذ سرابِ نکہتے
تا ز بند ایں گلستاں رستہ   آشیاں بر شاخ طوبیٰ بستہ ام

جرمنی اور برطانیہ کی اونچی اونچی یونیورسٹیوں اور نامی نامی اکاڈمیوں کے تجربہ کے بعد ہار اور تھک کر، فرنگی حکمیات اور معقولات کا یہ استاد اپنے مسلم بھائیوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

۱؎ سچی باتیں، مطبوعہ صدق ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۹ء

علم حق را در قفا انداختی	بهر نانے نقد دیں در باختی
گرم رَو در جستجوئے سرمۂ	واقف از چشمِ سیاہ خود نۂ

بی اے کی سند کے پیچھے، ایم اے کی ڈگری کی خاطر، "ڈاکٹر" کہلانے کے لئے "اپنے مقالہ THESIS کو قابلِ قبول بنانے کے لئے، نافہموں کی داد لینے کے لئے، فرنگیوں کی واہ واہ سننے کے لئے، پروفیسری کے لئے، ہیڈ ماسٹری کیلئے، ڈپٹی کلکٹری کیلئے، مجسٹری کیلئے، خاں بہادری کیلئے، کونسل اور اسمبلی کی ممبری کیلئے، ہائیکورٹ کی ججی کیلئے، وزارت کے لئے، ایگزیکٹو کونسل کی ممبری کے لئے۔ اے نادان اور بدنصیب مسلم، دیکھ تو، تو نے کتنی بڑی نعمت کا کفران کر ڈالا! علم حق جیسی دولتِ بے بہا کیسی پس پشت ڈال دی! چند روپیوں کے لئے، یا چند سو، یا چند ہزار کے لئے، لالچ میں آکر لازوال اور ابدی دولت سے دست بردار ہو گیا! اور ہیرے جواہرات کو چھوڑ کر، تانبے کے پیسیوں بلکہ کوڑیوں تک پر جھک پڑا!

سوزِ دل، سکونِ خاطر، عرفانِ حق کو بھلا ان ڈگریوں اور ڈپلوموں، ان امتحانوں اور ان سندوں، ان تنخواہوں اور ان عہدوں، ان منصوبوں اور ان خطابوں سے بھلا کوئی دور کا بھی واسطہ ہے؟

آب حیواں از دم خنجر طلب	از دہانِ اژدہا کوثر طلب
سنگ اسود از در بتخانہ خواہ	نافۂ مشک از سگ دیوانہ خواہ
سوز عشق از دانش حاضر مجوئے	کیف حق از جام ایں کافر مجوئے

ہر محال سے محال کی توقع کی جا سکتی ہے، ہر ناممکن چیز فرض کی جا سکتی ہے۔ لیکن "علوم جدیدہ" سے تشفیٔ قلب کی، عرفانِ حق کی توقع رکھنا، ان سب سے محال تر، ان سب سے ناممکن تر ہے!

جاوید نامہؒ

خالق کی "سب سے زیادہ تعریف کرنے والے" کا نام صدیقوں اور نورانیوں نے ہمیشہ جن جن القاب کے ساتھ لیا، وہ ہم اور آپ بارہا سُن چکے ہیں، مخلوق کے سب سے زیادہ تعریف کئے گئے کا ذکر شہیدوں اور ولیوں کی زبان پر جس جس طریقہ پر آیا، اس سے بھی خوب واقفیت ہو چکی ہے لیکن یہ بھی کچھ خبر ہے کہ اُس "احمدؐ اور محمدؐ" کے وقت اور زمانہ کے وقت اور زمانہ کے صدیق نہیں زندیق اور نورانی نہیں ظلماتی اُسے دیکھ دیکھ کیا کہتے تھے اور اسی کے جلو میں حق کی تائیدیں اور نصرتیں، ہر دم دیکھ دیکھ، آخر اپنے دل کی جلن اور کلیجہ کی پھنکن کیا کہہ کہہ کر ٹھنڈی کرتے تھے؟ زمانہ کا سب سے بڑا "روشن خیال" اور جمہوریۂ قریش کا سب سے بڑا لیڈر ابوجہل کہا جاتا ہے اور خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر شاید غلاف کعبہ کو تھام کر یوں صدائے "احتجاج" بلند کرتا ہے ؎

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ — از دمِ او کعبہ را شد گل چراغ!

از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود — نوجواناں را ز دستِ ما ربود

ساحر و اندر کلامش ساحری است — این دو حرفِ لا الٰہ خود کافری است

تا بساطِ دینِ آبا در نورد — با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد!

پاش پاش از ضربتش لات و منات
انتقام از وے بگیر اے کائنات

دل بغائب بست و از حاضر گسست
نقشِ حاضر را فسون او شکست

دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست
آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست!

خم شدن پیشِ خدائے بے جہات!
بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوات!

اس محمدؐ کی تحریک نے ہمارے دلوں کو چھلنی کر ڈالا ہے۔ ہمارے کعبہ کی رونق اس نے غائب کر دی! قیصر و کسریٰ کے مٹانے کے خواب دکھا دکھا کر، ہائے خود ہمارے نوجوانوں کو ہم سے چھین لیا! کیا زبردست ساحر ہے اور کلام تو سرتا پا سحر! اب اس سے بڑھ کر کفر صریح اور کیا ہو گا کہ دین کا کلمہ ہی لا الٰہ الّا اللہ قرار دیا ہے! جس دین کو ہمارے باپ دادا ہمیشہ سے مانتے چلے آئے اسی کو جھٹلا کر رکھ دیا ہے اور ہمارے معبودوں کی توہین کی تو حد کر دی، ہمارے "لات" ہمارے "منات" کسی کو بھی تو نہیں چھوڑا اور یہ اندھیر کہ اب بھی اس سے انتقام نہیں لیا جاتا! پھر یہ عقیدہ بھی تو ملاحظہ ہو کہ "آج" کو چھوڑ "کل" کو پکڑو۔ "حاضر" کچھ نہیں "غیب" ہی سب کچھ نقد کو چھوڑ "وعدہ" کے پیچھے دوڑنا، محسوسات کو چھوڑ ایک عالم غیب کے چکر میں پڑے رہنا، یہ آخر کہاں کی عقل ہے؟ جن معبودوں کو ہمیشہ ہم نے پوجا ہماری STATE نے پوجا، انہیں چھوڑ چھاڑ، ایک ان دیکھے خدا کے آگے سر جھکانے کے آخر معنی کیا؟ معصوم کی فردِ جرم کے عنوانات (نعوذ باللہ) اس موذی کی زبان سے ابھی کہاں ختم ہوئے آگے اور سنیے:۔

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب!

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ

ایں مساوات ایں مواخات عجمی است
خوب میدانم کہ سلماں مزدکی است!

ابنِ عبداللہ فریبش خوردہ است
رستخیزے بر عرب آوردہ است!

چشمِ خاصانِ عرب گردیدہ کور
بر نیائی اے زہیر از خاکِ گور

اے تو مارا اندریں صحرا دلیل — بشکن افسونِ نوائے جبرئیل!

اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر — خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر

اے منات اے لات ازیں منزل مرو — گر ز منزل می روی از دل مرو

اس کا مذہب غضب ہے غضب کہ ملک و زمین کی پرواہ کرتا ہے نہ خاندان ونسب کی کہاں کی قومی عصبیت اور قومیت، یہ تو عرب اور غیر عرب قریش وغیر قریش سب کو ایک سطح پر کئے ڈالتا ہے اندھیر ہے اندھیر کہ مساوات کا نام لے کر غلام و آقا کو ایک دسترخوان پر بٹھائے رہتا ہے، ہائے دل کو کیسے صبر آئے عرب کی بے عزتی ہو اور حبشہ کے کالے کلوٹوں کی عزت وقدر! یہ "مساوات" یہ "مواخات" ہمارے ہاں تھی کب؟ یہ سب اس سلمان فارسی کی لائی اور سکھائی ہوئی ہے۔ ہمارا بھتیجہ ابن عبداللہ اس مزدکی کے کہے سنے میں آ کر، آہ کیا اپنے ملک وملت کا دشمن ہو گیا ہے! اچھے اچھے اشرافِ عرب اس کے فسوں میں آ کر بہک چلے، اے زہیر، اے سحبان، اے امراء القیس، تم کہاں ہو اپنی قوم کی بربادی دیکھ رہے ہو اور پھر اپنی قبروں سے باہر نکل کر نہیں آتے؟ جبرئیل کے لائے ہوئے پیام کا اس کے پھیلائے ہوئے جادو کا توڑ اگر ہے تو تمہاری فصاحت وبلاغت ہیں، تمہاری ہی سحر کاری اور شاعری میں! اے اچھے اور بڑے دیوتا ہبل تمہیں کیا ہو گیا۔ اپنے پجاریوں کی تم بھی خبر نہیں لیتے؟ بے دینوں کو آخر کب تک مہلت دیئے جاؤ گے؟ اے پیاری دیویو! لات ومنات کہیں یہ غضب نہ کرنا کہ ہم سے روٹھ کر چلی جاؤ اور خیر اگر جانا ہے تو نہیں تمہارا ہی واسطہ کہیں ہمارے دل کی آبادیوں کو اپنی یاد سے ویران نہ کر دینا۔

شاعر کی آواز الہام کی آواز ہوتی ہے ہاں ہر شاعر کی نہیں، اس شاعر کی نہیں جو بے بصری کے ساتھ تخیل کی ہر وادی میں ٹھوکریں کھاتا اور اپنا سر ٹکراتا پھرتا ہے بلکہ اس شاعری کی جو ایمان کی روشنی میں بصیرت کی شعاعوں میں وانتصروا من بعد ما ظلموا کے

سایۂ رحمت میں، حقیقت کی منزلیں طے کرتا ہوتا ہے۔ اقبال، قوم میں اسی قسم کا شاعر ہے۔ اقبال کے نام سے خیال مسلم کانفرنس اور گول میز کانفرنس اور سیاسیات کی طرف نہ جائے۔ یہاں ذکر سیاسی اقبال کا نہیں اقبال شاعر کا ہے۔ اس اقبال کا ہے جس نے "قومی ترانہ" گایا امت کا "شکوہ" اپنے رب کو سنایا۔ "اسرار خودی" کی تشریح کی" رموز بیخودی" کو بے نقاب کیا اور مغرب زدوں تک "پیام مشرق" پہنچایا اور اب اپنی روئیداد دل کو "جاوید نامہ" کے نام سے پیش کرنے اٹھا ہے۔

یہ نئے طرز کی نعت، اسی اقبال کی زبان سے ابھی آپ نے سنی۔ نعت ایسی انوکھی نعت کبھوں کسی نے کہی ہوگی، لفظاً ہجو اور معناً نعت ہی نعت، ایسی نعت کی سند اگر ملتی ہے تو بندوں سے گزر رہیے، خود اللہ کے کلام میں، نوح اور ابراہیمؑ، لوطؑ اور صالحؑ، شعیبؑ، اور یونسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور سب سے بڑھ کر خاتم الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ظالموں اور طاغیوں نے جو گستاخیاں کیں، قرآن پاک نے آخر انھیں نقل ہی کر کے محفوظ کر دیا۔ یہ سب انبیائے کرام کی نعت نہیں تو اور کیا ہے؟ خفاش (چمگادڑ) اگر شور مچا مچا کر کہے کہ یہ دن کیسا تیرہ و تار ہے مجھے ذرا بھی نہیں سجھائی دیتا تو یہ انسانوں کیلئے دلیل اس کی ہوتی کہ دن تاریک نہیں خوب روشن ہے۔ اشقیا اگر جی بھر بھر کر کوسیں تو یہ اس کی ہجو نہیں اس کی مدح ہوتی۔ پیکر ظلمت و ضلالت کی زبان سے "چشمۂ نور ہدی" کے لئے سب و شتم نعت کی وہ لطیف قسم ہے کہ دوسروں کا ذہن بھی یہاں تک پہنچنا مشکل ہی تھا۔

جاوید نامہ کی زبان فارسی ہے، عارف رومی کی زبان اور بہت سے دوسرے محرمان اسرار کی زبان، خود ایک مثنوی ہے، جا بجا غزلیات سے آراستہ، خاکہ مثنوی یہ ہے کہ شاعر، شہر کے ہجوم و ہنگامہ سے گھبرا کر دریا کے کنارے چلا گیا ہے تنہائی میں ایک روز سر شام رومی کی یہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزو است   بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزو است

گنگنا رہا تھا کہ مولانا کی روحانیت دفعتہً منکشف ہوتی۔ اس روح کا مادی سراپا بھی ملاحظہ ہو جائے؎

طلعتش رخشندہ مثل آفتاب   شیب او فرخندہ چوں عہد شباب

طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب | شیبِ او فرخندہ چوں عہدِ شباب
پیکرے روشن ز نورِ سرمدی | در سراپایش سرورِ سرمدی!
بر لبِ او سرِّ پنہانِ وجود | بند ہائے حرف وصوت از خود کشود
حرفِ او آئینہ آویختہ | علم با سوز درون آمیختہ!

ایسا موقع مل کر کہاں ہاتھ سے دیا جا سکتا تھا۔ گفت وشنود، سوال وجواب سب لئے ہوئے اب فرشتہ زلاوان متمثل ہوتا ہے۔ جو روحِ زمان ومکاں ہے اور اس کی رہنمائی میں شاعر عالم ملکوت کی سیاحت کو روانہ ہوتا ہے۔ پیر رومی قدم قدم پر دستگیری کو موجود، اس عالم میں شاعر کی نظر سے جو جو منظر گزرتے ہیں ان کی وہ نوری عکسی تصویر SNAPSHOT لیتا جاتا ہے اور انہیں منظروں کو وہ دوسروں کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اعلیٰ علیین اور اسفل السافلین دونوں کی تجلیات جمالی وقہری کی جلوہ گاہ دونوں کی حیاتِ ابدی ایک سرے پر موسیٰ کلیم، دوسرے پر فرعون، حیاتِ جاودانی کے حصہ دار دونوں اپنے اپنے رنگ میں! مرقع کو شاعر جاوید نامہ کہہ کر نہ پکارتا تو اور کیا کہتا؟

نوحہ "ابوجہل" ابھی آپ سن چکے۔ اب ذرا نالۂ فرعون بھی، عبرت کے کانوں سے سنتے چلئے فرعون جہاں ہے اس مقام کی ویرانی کا کیا پوچھنا ہے

کوہ ہائے خشتہ وعریان وسرد | اندراں سرگشتہ وحیراں دو مرد!

وہ مقام ہے ہی مخصوص زور آوروں، منکروں گردن کشوں، غیب کے منکروں اور حواس پرستوں کے لئے۔ مولانا کی روحانیت ساتھ ساتھ ہے پتہ بتاتی ہے کہ

ایں مقام سرکشانِ زور مست | منکرانِ غائب وحاضر پرست!

لیکن فرعون یہاں تنہا نہیں ہے، ایک دوسرا فرعونِ وقت بھی اس پچھلے فرعون کے ہم نشین وہم پہلو ہے وہ فرعون مصری ہزارہا سال قبل کا تھا، یہ فرعون اسی بیسویں صدی کا ہے۔ "ملک" "مصر" کا اور "دریا" کا، تعلق دونوں سے ایک شرقی ایک غربی۔ ایک پیمبر کے مقابلے میں اکڑنے والا دوسرا ایک درویش کو ستانے والا عدو اللہ دونوں کے

دونوں۔ انجام کے عبرت انگیز ہونے کے لحاظ سے دونوں ایک۔ انتہائی ساز وسامان کے باوجود دریا میں ڈوب کر ہلاک ہونے والے دونوں!

آں یکے از شرق و آں دیگر زِ غرب ... ہر دو با مردانِ حق در حرب و ضرب!
آں یکے بر گردنش چوبِ کلیم ... واں دگر از تیغ درویشے دو نیم!
ہر دو فرعون، ایں صغیر و آں کبیر ... ہر دو در آغوشِ دریا تشنہ میر!
ہر کسے با تلخیٔ مرگ آشناست ... مرگِ جباراں ز آیاتِ خداست!

مولانا کی نورانیت سے فضا کی تیرگی وقتی طور پر منور ہو جاتی ہے اور ظلمات کا تاجدار حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ اس ظلمت کدہ میں یہ روشنی کی شعاعیں کہاں سے!

گفت فرعون، ایں سحر ایں جوئے نور! ... از کجا ایں صبح و ایں نور و ظہور!

مولانا فرماتے ہیں اے ید بیضا کے منکر، آج تو اس نور کا اقرار کرنا پڑا! فرعون بے سامان کی آہ و زاری اُن کے سننے کے قابل ہے جو آج فرعون با سامان بنے ہوئے ہیں ؎

آہ نقدِ عقل و دیں در باختم ... دیدم و ایں نور را نشناختم
اے جہانداراں سوئے من بنگرید ... اے زیاں کاراں سوئے من بنگرید
وائے قومے از ہوس گم دیدہ کور ... می برد لعل و گہر از خاکِ گور
پیکرے کو در عجائب خانہ ایست ... بر لب خاموش او افسانہ ایست!
از ملوکیت خبر ہا میدہد ... کور چشماں را نظر ہا میدہد

ہائے افسوس کہ میں زندگی بھر عقل اور دین دونوں سے محروم رہا، ہیہات کہ آنکھوں کے سامنے روشنی رہی اور مجھ بد بخت نے اُسے نہ دیکھا۔ دنیا کے تاجدارو! اے غفلت کے متوالو، میری مثال سے عبرت حاصل کرو نصیحت پکڑو، عبرت، عبرت کہ اب دنیا میں ایسی قوم پیدا ہوئی ہے۔ حرص و ہوس میں اندھا دھند غرق جو دولت بٹورنے کی دھن میں مقبروں تک کو کھود ڈالتی ہے اور مدفون سلاطین کی لاشوں سے لال و جواہر اتارتی رہتی ہے! میرے جسم کو انھوں نے نکال کر عجائب خانہ میں رکھا ہے، حالانکہ وہ خود

ایک خاموش وعظ کہہ رہا ہے بادشاہوں کا انجام یہ ہوتا ہے! عبرت کی آنکھ رکھنے والو میرے انجام سے عبرت و نصیحت حاصل کرو!

سارا تمرد ساری شیخی، ساری گردن کشی، بس زندگی بھر تھی اب آرزو اور التجا ہے تو یہ ہے ؎

باز اگر بینم کلیم اللہ را
خواہم از وے یک دل آگاہ را

کاش اب کلیم اللہ کی زیارت نصیب ہوتی۔ اب جو وہ ملتے تو اب ان سے نور ایمان ہی کو طلب کرتا!

بیسویں صدی کے فرعون کو آپ نے پہچانا؟ یہ وہ "ذرد الخرطوم" ہے جسے دُورِ جدید کے فرعونیوں نے لارڈ کچنر آف خرطوم کہہ کر پکارا، مہدی سوڈانی کی قبر کو کھود ڈالنے والا اور خود اپنے انتہائی عروج کے وقت سمندر میں اس طرح غرق ہو کر رہنے والا کہ لاش کا بھی آج تک پتہ نہ چلا۔ اس بڑے فرعون سے، وہ مصر کا چھوٹا فرعون پوچھتا ہے اور اس انداز سے پوچھتا ہے کہ آس پاس کے سننے والوں کے دل بھی عبرت سے ہل جاتے ہیں ؎

قبر ما را علم و حکمت بر کشود
لیک اندر تربت مہدی چہ بود

میرے مقبرہ کو تو تم لوگوں نے علمی تحقیقات کا نام لے لے کر کھودا، لیکن ظالم یہ تو بتا کہ غریب مہدی سوڈانی کی قبر کھود ڈالنے سے تجھے کون سی اثری تفتیش اور علمی تحقیق مقصود تھی؟

معاً جنت کی خوشبوؤں کی لپٹیں آنے لگتی ہیں اور ان میں بسی ہوئی سوڈان کے مظلوم درویش کی روح برق کی طرح چمکتی اور جگمگاتی متمثل ہو جاتی ہے اور ظالم کو سن کر کہتی ہے ؎

گفت اُے کشنر اگر داری نظر
انتقام خاکِ درویشے نگر!

آسمان خاک ترا گورے نداد
مرقدے جز در یم شورے نداد"

اے بصارت سے محروم کچنر اب تو تو نے اپنا بھی انجام دیکھ لیا، ایک بے بس درویش کا انتقام تجھ قدرت والے اور حکومت والے سے کیسا لیا جا کر رہا! تو نے قبر سے نکال کر

کسی جسم کو بے حرمت کیا تھا! نتیجہ دیکھا کہ تیرے لاشہ کے قبول کرنے سے سطح زمین کے چپہ چپہ نے انکار کر دیا اور آخر تجھے جگہ ملی تو شور سمندر کی تہ میں! اس کے بعد اس مجاہد کی روح قلب کے سوز اور سینہ کے گداز کے ساتھ یوں مناجات میں لگ جاتی ہے۔

گفت "اے روحِ عرب بیدار شو | چوں نیاگاں خالقِ اعصار شو!
اے فواد، اے فیصل، اے ابنِ سعود | تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود!
زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت | در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت!
خاکِ بطحا، خالدے دیگر بزاے | نغمۂ توحید را دیگر سراے
اے نخیلِ دشتِ تو بالندہ تر | بر نہ خیزد از تو فاروقے دگر!
اے جہانِ مومنانِ مشک فام | از تو می آید مرا بوئے دوام!
زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر | تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر!
بر مقامِ خود نیائی تا بہ کے | استخوانم در بدن نالد چو نے!"

اے عرب کی روح! تو کیوں بیدار نہیں ہوتی اور کیوں نہیں اپنے وہ کارنامے دکھا دیتی، جو تیرے اسلاف چھوڑ گئے ہیں۔ اے مصر کے، عراق کے حجاز کے بادشاہو! کب تک بس اپنی نفسی نفسی میں پڑے رہو گے! اٹھو اور اپنے دلوں میں وہ سوز پیدا کرو جو آخر کبھی تو وہ چکا ہے! اٹھو اور ہمت کرو کہ عظمت کے گذرے ہوئے دن پھر واپس آجائیں!! اے خاکِ مکہ، کاش تو ہی کسی دوسرے خالد جانباز کو از سرِ نو پیدا کرے اور دنیا کو ایک بار پھر توحید کا ترانہ سنا دے! اے سرزمینِ پاک! اللہ تیرے ریگستان کے کھجوروں میں برکت دے! کیا اب تجھ میں کوئی دوسرا فاروق اعظم نہ پیدا ہوگا؟ اے حبشہ کے پیارے باشندو، مشک کی سی صورت اور رنگ رکھنے والو، تم مجھے کس قدر محبوب ہو لیکن ہمت اور عزم اور ولولہ کے بغیر زندگی کا لطف کیا؟ وہ زندگی ہی کیا جو غیر کی محکومی میں ہو! اللہ وہ دن کب لائے گا جب تمہیں تمہارے اصلی مقام پر فائز دیکھوں میری ہڈی ہڈی سے دعا نکل رہی ہے تو یہی!

سیاسی مخالفوں نے اقبال کو طرح طرح بدنام کیا ہے اور "ٹوڈی" اور سرکار پرست اور غدارِ ملت اور خدا معلوم اور کیا کیا خطابات عطا کر رکھے ہیں لیکن اقبال کے جو اصلی خیالات ہیں وہ خود انھیں کی زبان سے ملاحظہ ہوں۔

مرشد آباد (بنگال) کے میر جعفر اور میسور دکن کے مشہور شیر دل فرمانروا ٹیپو سلطان کے زمانے کے میر صادق سے تاریخ کا کون طالب علم ناواقف ہے؟ ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمانے کے خاص اسباب، انھیں دونوں بزرگواروں کی کارگذاریاں ہوئی ہیں۔ کم از کم اقبال کا تاریخی مطالعہ انھیں اسی نتیجہ تک پہنچاتا ہے۔ اقبال ان دونوں کو اپنی سیر سماوی میں دیکھتے ہیں

جعفر از بنگال و صادق از دکن　　　ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

مگر کہاں؟ کیا جنت میں؟ جنت میں نہ سہی اعراف میں؟ نہیں، دوزخ میں بھی نہیں! دوزخ بھی ایسے ارواحِ رذیلہ سے پناہ مانگتا اور انہیں اپنے اندر لینے سے انکار کر رہا ہے! ایک عالم انتہا درجہ کا مہیب و زہرہ شکن روبرو ہے۔ مردودیت و مقہوریت سے لبریز۔ تیرہ و تار، انوار سے دور، ظلمتیں اس پر محیط!

عالمے مطرود و مردودِ سپہر　　　صبح او مانند شام از بخلِ مہر!
منزلِ ارواحِ بے یوم النشور　　　دوزخ از احراقِ شاں آمد نفور

اس جہاں میں ایک قلزم خونیں رواں ہے اس کی ہولناکیوں کا کیا بیان ہو۔ ہوش و حواس فرط ہیبت سے غائب، معانی الفاظ کے سایہ سے گریزاں! اف ری دہشت،

تن ز سہمش بے خبر گرد د زجاں!

موج ہا در زندہ مانندِ پلنگ　　　از نہیبش مردہ بر ساحل نہنگ

اس بحر خونیں میں وہی دو غدارانِ وطن ایک کشتی پر بیٹھے اپنی قسمت کو روتے اور شیر سے بڑھ کر مہیب موجوں کے تھپیڑے کھاتے آپ ڈوبتے اور جب ڈوبتے ہوئے

اندراں زورق دو مردِ زرد روئے　　　زرد رُو، عریاں بدن، آشفتہ موئے!

اتنے میں خود ارضِ ہند ـــــ "آں عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں" ـــــ

کی روح نمودار ہوتی ہے، حسین وجمیل، جبین پر نور، اور آنکھیں پرسرور، لیکن قید وبند میں جکڑی ہوئی اور زباں پر آہِ سوزاں اور نالہائے پُر درد، عارف رومی کی روحانیت بتاتی ہے کہ یہی ہندستان مظلوم ہے ے

گفت رومی "روحِ ہندست این نگر — از فغانش سوزہا اندر جگر!"

روحِ ہندوستان عالم بالا میں فریاد کر رہی ہے اور رو رو کر دوسروں کو رلا رہی ہے۔

مُردِ جعفر زندہ روحِ او ہنوز!

جعفر تو گیا، لیکن جو بیج بو گیا، وہ بہرحال ایک تناور درخت ہو چکا ہے۔

ملتے را ہر کجا غارت گرے است — اصلِ او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں — الاماں از جعفرانِ ایں زماں

آج بھی جتنے قوم فروش اور غدارِ ملت موجود ہیں ان سب کی اصل کسی صادق کسی جعفر غرض کسی غدارِ اعظم ہی تک پہنچتی ہے، اللہ ان غداروں سے بچائے، اللہ اس جعفر کی تخم ریزی کے ثمرات سے اپنی حفظ وامان میں رکھے ان بدبختوں کا ٹھکانہ دوزخ میں بھی نہیں اپنے سروں کو پیٹ پیٹ کر فریاد کر رہے ہیں۔

نے عدم ما را پذیرد نے وجود — وائے از بے مہری بود ونبود!

تا گزشتیم از جہانِ شرق وغرب — بر در دوزخ شدیم اندر دو کرب!

ق

یک شرر بر صادق وجعفر نزد — بر سر ما مشتِ خاکستر نزد

گفت دوزخ را خس وخاشاک بہ — شعلۂ من زیں دو کافر پاک بہ

ہائے ہماری کم بختی، کہ زندگی ہم کو پوچھتی ہے نہ موت! ہائے ہماری شامت اعمال کہ موت وحیات دونوں ہم سے روٹھ گئے! ہائے ہماری بدنصیبی کہ دنیا سے گذر کر ہم عالم آخرت میں پہنچے تو دوزخ کے دروازے پر گئے کہ کاش وہی ہمیں قبول کر لے جس عذاب ناقابلِ بیان میں ہم گرفتار ہیں اس سے تو شاید جہنم ہی کی آگ غنیمت ہوتی، لیکن ہم کمبختوں کو تو دوزخ تک نے

قبول نہ کی۔ بلکہ واپس کر دیا، اور خود پناہ مانگنا شروع کر دیا کہ الٰہی! ایسوں کے سایہ سے محفوظ رکھ! کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنی مدد کیلئے پکار رہے ہیں، کوئی بھی ان پر نگاہ رحم نہیں ڈالتا کوئی بھی ان کی فریاد کو نہیں پہنچتا ؎

اے ہوائے تند! اے دریائے خون! اے زمین! اے آسمانِ نیلگوں!

اے نجوم! اے ماہتاب! اے آفتاب! اے قلم! اے لوحِ محفوظ! اے کتاب

اور شعر تو یہ کہا کہ، اس ایک شعر پر دوسروں کے دیوان قربان

اے تہانِ ابیض! اے لُردانِ عرب! اے جہاں در بغل بے حرب و ضرب!

اے گورے رنگ کے خداوند! اے فرنگستان کے امیر اور امیرزادو! سارے جہاں کو بے لڑے بھڑے اپنے قبضہ میں لے لینے والو!

کیا سارے "کانگریسی" لٹریچر میں اس سے زیادہ کچھ مل سکتا ہے کیا بڑے بڑے احرار نے اس سے زیادہ کچھ کہا ہے؟

ایں جہاں بے ابتدا بے انتہا ست! بندۂ غدار را مولا کجا ست!

یہ وہی بدنام اقبال ہے جو (بعض مہربانوں کا خدا بھلا کرے) بیچارہ خود ہی اپنی قوم میں غدار قوم فروش اور خدا جانے کن کن خطابات سے سرفراز ہو چکا ہے! ہا! دنیا بھی کیسی اندھی ہے اور اس کے فیصلے کس قدر نامنصفانہ ہوتے ہیں!

ہاں اقبال کا جرم یہ ضرور ہے کہ اتنی وطن دوستی کے باوجود وہ وطن پرستی کا روادار نہیں اس کا مذہب وہی ہے جو شیخ الہند محمود حسن رح کا تھا۔ احرار کے رہبر و سردار محمد علی رح کا تھا۔ اسے مقصود وطن کی خدمت ہے، وطن کی پرستش نہیں، وطنیت کا جو بت فرنگیوں کا گڑھا اور کھڑا کیا ہوا ہے اس شتر کا اس نے تار تار الگ کر کے رکھ دیا ہے ظاہر بین خوش ہو رہے ہیں کہ ایران رضا شاہ پہلوی کے عہد میں کیسی کیسی ترقیاں کر رہا ہے شاعر کی نگاہِ حقیقت شناس دیکھ رہی ہے کہ یہ "ترقی" عین ترقیٔ معکوس ہے ؎

کشتۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ | خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ!
کارِ آں وارفتۂ ملک و نسب | ذکرِ شاپور است و تحقیرِ عرب!
روزگارِ او تہی از واردات | از قبورِ کہنہ می جوید حیات!
با وطن پیوست و از خود درگذشت | دل برستم داد و از حیدر گذشت!
نقش باطل می پذیرد از فرنگ | سرگذشتِ خود بگیرد از فرنگ

یہ ناداں اتنا نہیں سمجھتے کہ شاپور اور یزدجرد کی عظمتیں تو از خود بجھ چکی تھیں ایران کے تنِ مردہ میں اگر جان دوبارہ پڑی تو اسلام ہی کے طفیل میں، بادیہ نشینانِ عرب ہی کی مسیحائی سے۔ ایران اور روما اپنے زمانہ کی دو برابر کی طاقتیں تھیں ایران نے اسلام قبول کر لیا۔ آج تک زندہ ہے روما نے دینِ الٰہی سے اعراض کیا مدت ہوئی نام و نشان بھی نہ باقی رہا۔

موجِ مے در شیشۂ تاکش نبود | یک شرر را تودۂ خاکش نبود!
تا ز صحرائے رسید آں محشرے | آنکہ داد او را حیاتِ دیگرے!
ایں چنیں حشر از عنایاتِ خدا است | پارس باقی رومۃ الکبریٰ کجاست؟
مردِ صحرائی بہ ایراں جاں دمید | باز سوئے ریگ زارِ خود رمید!
آہ احسانِ عرب نشناختند | ز آتشِ افرنگیاں بگداختند

وطنیت کا افسوں بھی عجب افسوں ہے ترک ترکیت میں، ایرانی ایرانیت میں، مصری مصریت میں، عرب عربیت میں غرق ہوتے جا رہے ہیں اور اسلامیت کی طرف سے غافل و بے پروا حالانکہ نظم و مرکزیت اگر پیدا ہو سکتی تھی تو صرف اسلامیت ہی کے رشتہ سے، جھاڑ دکا بند کھل گیا اور ایک سینک سرد و نازاں ہے کہ آزادی مل گئی! یہ وطنیت نہیں ہے محمد علی کے الفاظ میں "وثنیت" ہے توحیدِ الٰہی کے مقابلہ میں ایک دوسرا بُت!

لُردِ مغرب آں سراپا مکر و فن | اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن
او بفکرِ مرکز و تو در نفاق | بگذر از شام و فلسطین و عراق
تو اگر داری تمیزِ خوب و زشت | دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت

آہ کیسی نادانی اور کور فہمی ہے کہ جو جنت کا طالب تھا وہ محض مٹی کے ڈھیلوں پر قانع ہو کر رہ گیا ہے اور اس پر فخر کر رہا ہے!

چیست دیں؟ برخاستن از روئے خاک | تا زخود آگاہ گردد جانِ پاک!
می نہ گنجد آنکہ گفت اللہ ہو | در حدودِ ایں نظامِ چار سو

آفتاب نکلتا بیشک مشرق سے ہے، لیکن نکل کر پھر مشرقی نہیں رہ جاتا، شرق و غرب، شمال و جنوب سب ہی اس کے احاطۂ تسلط میں آجاتے ہیں بات بالکل موٹی ہے مگر جو سمجھنا نہ چاہیں ان کے دل میں کیسے اتار دی جائے شاعر غریب اپنی والی سمجھانے میں کچھ اٹھا رکھتا نہیں ہے

آں کفِ خاکے کہ نامیدی وطن | ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہلِ وطن را نسبتے است | زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر | نکتۂ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق برآید آفتاب | با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوزِ دروں | تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں
فطرتش از مشرق و مغرب بری است | گرچہ او از روئے نسبت خاوری است!

وطن کی نسبت تو جانور بھی رکھتے ہیں، وطن کیلئے تو کتے اور بلی بھی جان دے سکتے ہیں۔ انسان کیلئے یہ کون سی فخر کی بات ہے کہ مٹی کے گھروندوں کے پیچھے جان دے رہا ہے، اُسے مرنا چاہیئے تو کسی مقصد IDEAL کے خاطر اور مرضیٔ حق کی طلب سے بڑھ کر بلند تر کوئی مقصد اب تک دنیا کے سامنے پیش ہو سکا ہے؟ دوسری قوموں کی اگر نظر بھی ان بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتی تو وہ بے چاری معذور رہیں، غصہ اپنوں پر آتا ہے ان پر کیا شامت سوار ہے کہ آسمانوں کے ہوتے ہوئے زمین کی طرف جھکتے اور گرتے ہیں؟

سیاسیات کی بحث تو بہت بعد کو آتی ہے فرنگیوں کے ہاتھ میں اصل جادو تو انکی جگمگاتی ہوئی تہذیب کا ہے جس کیلئے اقبال نے بھی کہیں اور (شاید اسرار خودی میں) کہا ہے

گلستانے لالہ زارے عبرتے ۔ چوں گلِ کاغذ سراب نکہتے

ان کے جگمگاتے ہوٹل اور ناچ گھران کے کلب اور شراب خانے، ان کے چڑیا گھر اور عجائب خانے ان کے بنک اور کوٹھیاں، ان کے سینما اور تھیٹر، شاعر اس نگار خانے میں قدم رکھتا اور رنگ رنگ کے سوانگ کو دیکھتا ہے اور زیر لب مسکراتا جاتا ہے ؎

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب ۔ نے ز رقصِ دختران بے حجاب!

نے ز سحرِ ساحران لالہ روست ۔ نے ز عریاں ساق نے از قطع موست!

محکمی او را نہ از لادینی است ۔ نے فروغش از خطِ لاطینی است!

"محکمی" اور "قوت" اور "فروغ" کا اعتراف بہتان اب بھی موجود ہے۔ ایک قدم آگے بڑھ کر، وضوح کامل ہو جاتا ہے اور حقائق سے پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے ؎

می شناسی چیست تہذیبِ فرنگ ۔ در جہانِ اُو دو صد فردوس رنگ!

جلوہ ہایش خانماںہا سوختہ ۔ شاخ و برگ و آشیاںہا سوختہ!

ظاہرش تابندہ و گیرندہ ایست ۔ دل ضعیف است و نگہ را بندہ است!

چشم بیند دل بلغزد اندرون ۔ پیشِ ایں بتخانہ افتد سرنگوں!

ایک جگہ اور ان کی منع تولید (اولادکشی) وغیرہ کی کوششوں کا ذکر کرکے کیا خوب کہا ہے کہ ان سے لینے کے قابل کوئی چیز بجز عبرت کے ہے کیا؟

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ ۔ مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ

حقہ بازاں چوں سپہرِ گرد گرد ۔ از امم بر تختۂ خود چیدہ نرد!

شاطراں، این گنج درآن رنج بر ۔ ہر زماں اندر کمینِ یک دگر

فاش باید گفت سرِّ دلبراں ۔ ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں!

دیدہ ہا بے نم ز حبِّ سیم و زر ۔ مادراں را بار دوش آمد پسر

وائے بر قومے کہ از بیمِ ثمر ۔ می برد نم را ز اندامِ شجر!

تا بتارِ روز خم از نازشِ سرود ۔ می کشد نا زادہ را اندر وجود!

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ　　　من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

اس باجوجیت کے عروج کو دیکھ کر مسرت اگر کسی کو ہے تو معبود قدیم، ہبل کو کیا اچھل پھل کر گا رہا ہے کہ (خاکم بدہن) اب فتح میں کیا دیر ہے محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کو اب مار ہی گرایا ہے ؎

زندہ باد افرنگئ مشرق شناس　　　آنکہ ما را از لحد بیرون کشید

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

در نگر آں حلقۂ وحدت شکست　　　آل ابراہیم بے ذوق الست!

مردِ حُر افتاد در بندِ جہات　　　با وطن پیوست و از یزداں گست!

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

شاعر گھومتا گھامتا کرہ مریخ میں پہنچتا ہے اور یہاں ایک لیڈی صاحبہ سے دوچار ہوتا ہے پہلے ان کا سراپا ملاحظہ ہو:-

چہرہ اش روشن و لے بے نورِ جاں　　　معنیٔ او بر بیانِ او گراں!

حرف او بے سوز و چشمش بے نمے　　　از سرورِ آرزو نا محرمے!

فارغ از جوشِ جوانی سینہ اش　　　کور و صورت ناپذیر آئینہ اش!

چہرہ کا رنگ گورا، لیکن باطن سیاہ اور قلب بے نور زبان رواں، لیکن معنی الفاظ کا ساتھ چھوڑے ہوئے نہ الفاظ ہیں سوز و گداز کا پتہ، نہ آنکھوں میں کسی تری کا نشان۔ قلب، مقصد اعلیٰ (ایمان) سے ناآشنائے محض! دیکھنے میں جوان، لیکن جوانی میں جو ولولے فطرتاً ہوتے ہیں وہ سب غائب، گویا ایک آئینہ جس کی جلد اڑی ہوئی اور ان صاحبہ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ ؎

از مقام مرد و زن دارد سخن　　　فاش تر می گو بدا سرار بدن!

مرد و عورت کے تعلقات پر خوب خوب نکتہ بیان کرتی ہیں اور اعضائے جسم کی تشریح تو اس قدر بے جھجک ہو کر بیان فرماتی ہیں کہ شرم و حیا کہیں آس پاس بھی نہیں ہوتی ایسی

نادرِ نعمت بھلا مریخ کی پیداوار کہاں ہو سکتی تھی "بتایا یہ گیا کہ

فرزمرزا ورا بدنہ دید از فرنگ

کرہ مریخ کا ابلیس اُنھیں ارض فرنگستان سے اٹھا لایا ہے۔ یہ خاتون دعوت [redacted] کرتی ہیں زن پرستوں کے ملک میں نبوت عورت کو نہ ملتی تو اور کسے ملتی؟ یہ" روشن خیال" "روشن ضمیر" "حریت پرور، برق زبان،" "نبیّہ" تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں تو بس بعینہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لیڈیز کانفرنس کے پنڈال میں کسی رزولیوشن پر دادِ خطابت دی جا رہی ہے وہی مردوں کے مظالم کی داستاں .... وہی نسوانیت سے انکار، وہی آزادی کی رٹ، وہی فطرت سے جنگ پہ دلیری اور آخر میں وہی برتھ کنٹرول کی سائنٹیفک دعوت!

اے زنان! اے مادراں! اے خواہراں!
زیستن تا کے مثالِ دلبراں!

دلبری اندر جہاں مظلومی است
دلبری محکومی و محرومی است!

در دو گیسو شانہ گردانیم ما
مرد را نخچیرِ خود دانیم ما

خود گداز یہائے او مکر و فریب
درد و داغ و آرزو مکر و فریب

گرچہ آں کافر حرم سازد ترا
مبتلائے درد و غم سازد ترا

ماربیچاں! از خم و پیچش گریز
زہر ہائیش را بخون خود مریز!

از اُمومت زرد روئے مادراں!
اے خنک آزادیٔ بے شوہراں!

آمد آں وقتے کہ از اعجازِ حق
می تواں دیدن جنین اندر بدن!

گر نباشد بر مرادِ ما جنین
بے محابا کشتنِ او عین دیں!

در پس ایں عصر اعصارِ دگر
آشکارا گردد اسرارِ دگر

پرورش گیرد جنیں نوعِ دگر
بے شبِ ارحام دریابد سحر!

تا بمیرد آں سراپا اہرمن
ہمچو حیوانات ایامِ کہن!

خیز و با فطرت بیا اندر ستیز
تا ز پیکارِ تو حُرّ گردد کنیز!

اے معزز خاتونو! اے ماؤ! اے بہنو! یہ گڑیوں کی سی پردہ کی زندگی کب تک؟ یہ خانگی زندگی، تم اسے محبوبی کجھتی ہو، حالانکہ یہ عین غلامی ہے محکومی ہے محرومی ہے، مظلومی ہے! تمہاری آزادیاں سلب کر لی گئیں، تمہارے حقوق پامال کر دیئے گئے، تمہیں لونڈی بنا دیا گیا اور تم اپنی سادہ دلی سے خوش ہو رہی ہو کہ گھر کے اندر شوہر تمہاری خاطر داریاں کرتے رہتے ہیں، خود تمہارے اشاروں پر چلتے رہتے ہیں! یہ محض دھوکا اور فریب ہے مرد کی یہ محض چالیں ہیں! خبردار آج سے اس فریب میں نہ آنا وہ لاکھ تمہاری دل دہی کریں تمہیں چہیتی بیوی بنا کر رکھے اپنی معشوقہ بنائے تم سے لاکھ مہر و الفت کے پیاں کرے ہرگز اس کی باتوں میں نہ آنا، اس کے جال میں نہ پھنسنا، سب مکر ہے مکر، اس کا مقصد محض تمہیں اپنی کنیزی میں لینا ہے۔ اُف، ظلم ہے ظلم، کہ تمہیں بچہ جننے کی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے! اہا کیا پیارا اور خوش آئند ہوگا وہ دن جب ہم شوہروں کی قید سے آزاد بچہ جننے کی کلفتوں سے آزاد، بے شوہر بلا روک ٹوک آزادی کامل کے ساتھ گھومتی پھریں گی، اور میں آپ کو بتاؤں، ہماری سائنٹفک ترقیاں اب اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ ہم رحم کے اندر کا حال اپنے آلات سے مشاہدہ کر لیتے ہیں اور اب ہمارے بالکل اختیار میں ہے کہ چاہیں تو رحم میں بچے کو بڑھنے اور پلنے دیں اور چاہیں تو اسی وقت اس کا خاتمہ کر دیں۔ اور ابھی کیا ہے ایک دن اور آتا ہے۔ کیا مبارک دن وہ آنے والا ہے جب مرد کی وساطت کے بغیر اگر جی چاہے گا تو ہم خود ہی بچہ پیدا کر لیا کریں گے اور رفتہ رفتہ ہم اس کرخت مخلوق کو جس کا نام مرد ہے میدان کائنات سے فنا کر کے رہیں گے، جیسے اس سے پیشتر بھی رفتار ارتقاء میں بے شمار قسم کے حیوانات فنا ہو چکے ہیں! اٹھو میری بہادر خاتونو! ہمت کر کے اٹھو! لڑو اپنی آزادی کی خاطر، حریت کاملہ کی خاطر، فطرت سے لڑو اور فطرت کے جن قاعدوں اور قانونوں نے تمہیں اب تک زیر کر رکھا تھا۔ انہیں توڑ، پھوڑ کر رکھ دیا۔

عارف رومی کی روح ماتیت حیرت و عبرت کیساتھ اس خطبہ حریت کو سنتی رہتی ہے اور پھر شاید عبرت و حسرت کے لہجے میں یوں زمزمہ سنج ہوتی ہے۔ مذہب عصر نو آئینے نگر ۔ حاصل تہذیب لادینے نگر! تہذیب جدید کا مسلک دیکھ لیا! یہ دینوں کے تعلیم و تمدن کے اثرات چکھ لیئے۔ اور اس سے زیادہ یا اس کے علاوہ ہم اور آپ اور کوئی کچھ ہی کیا سکتا ہے۔

٭ ٭ ٭

ارمغانِ حجاز

اقبال کی موت، ایک شخصی و انفرادی حادثہ نہیں، امت اسلامیہ کے حق میں ایک صدمہ عظیم تھی۔ حکمت کاملہ نے علین اس وقت انہیں اٹھالیا، جب ہم ظاہر بینوں کی محدود نگاہیں ان کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس کر رہی تھیں اور اب دل کی کلیاں مرجھا چلی تھیں کہ قافلۂ امت کا بانگ درا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا لیکن غنیمت ہے کہ زبان آہنگ بند ہوتے ہوتے کچھ نئے نغمے سنا گئے۔ اور یہ انہیں آخری نغموں کا مجموعہ ہے جو ارمغانِ حجاز کے نام سے خوشنما کاغذ اور طبع و کتابت اور دیدہ زیب جلد کے ساتھ ظاہری دلکشی سے پوری طرح آراستہ ابھی نکلا ہے اور شیخ محمد اشرف صاحب تاجر کتب کشمیری بازار لاہور سے مل سکتا ہے۔

ضخامت ۲۸۰ صفحات کی ہے اس میں سے ۲۱۰ صفحے فارسی کی نذر ہیں باقی ۷۰ صفحوں میں منظومات اردو ہیں۔ کلام کا اصلی لطف تو پوری کتاب پڑھنے سے آئے گا باقی جستہ جستہ مقامات کی سیر اس سرسری تبصرہ کے ذریعہ بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اقبال نے شکوہ جوانی کے زمانے میں لکھا تھا شکوہ کس کا کس سے تھا؟ بندہ کا مالک سے، عبد کا معبود سے، غلام کا آقا سے تھا۔ بندہ کو اپنی بندگی کا احساس پورا پورا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے مولیٰ و آقا کی شفقت پر اعتماد بھی ہے وہ اس سے جتنا ڈرتا ہے اس سے زیادہ اس سے ناز بھی کرتا رہتا ہے اور مقام ناز پر آکر معلوم ہے کہ بندہ کتنا شوخ گفتار ہو جاتا ہے" ارمغانِ حجاز" جوانی کے بعد کا کلام ہے لیکن ابھی شکوۂ دلی

شوخ گفتاری کا انداز جا بجا اس میں موجود ہے اور چونکہ پختہ کاری کے ساتھ ساتھ سوزِ دل بھی اب بہت بڑھ گیا ہے اس لئے قدرۃً طنز میں شدت اور تعریض میں حدت بھی اب ترقی پر ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ رُوئے زمین کے چپہ چپہ پر اغیار چھائے جا رہے ہیں اور مسلمان ہیں کہ وسعتِ ارض ان پر روز بروز سکڑتی اور تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک صاف اور سادہ حقیقت ہوتی۔ شوخ گفتار شاعر اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر اپنے ترکش طنز سے تیر چلاتا ہے اور کہتا ہے کہ "کیوں نہ ہو" زمین کی یہ بخشش سوداگروں اور دوکان دار قوموں پر کیوں نہ ہو اور اپنے پیدا کئے ہوئے جہاں سے اپنے ہی کیوں نہ محروم رکھے جائیں، لامکاں والے کو دنیا زادوں کے مکان کی قدر ہی کیا ہو سکتی ہے!

چہ حاجت طول دادن داستاں را   بحرفے گویم اسرارِ نہاں را
جہانِ خویش با سوداگراں داد   چہ داند لامکاں قدرِ مکاں را!

شوخی کا ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور بندہ جلے ہوئے دل سے یوں گویا ہوتا ہے۔ کہ فرنگی کو دیکھو، کس طرح دورِ حاضر کا رزاق بن گیا ہے، شیطان کی کس کس طرح رزاقی کرتا ہے کہ (نعوذ باللہ) خود رزاقِ حقیقی کو حیرت ہو کر رہ جاتی ہے۔!

فرنگ آئینِ رزاقی بداند   بدیں بخشد از و وامی ستاند
بہ شیطاں آنچناں روزی رساند   کہ یزداں اندراں حیراں بماند

اہلِ سکر و جذب کو عالم بیخودی میں ایسی گستاخی گوئی ہمیشہ سے معاف رہی ہے عارفِ روم کی زبان ہیں

ہیچ آدابے و ترتیبے مجو   ہر چہ میخواہد دلِ تنگت بگو
کفرِ تو دیں ست و دینت نورِ جاں   ایمنی وز تو جہانے در اماں
اے معاف یفعل اللہ ما یشا   بے محابا او زباں را برکشا

لیکن یہ رنگ کہیں کہیں ہے ورنہ اصل تعلیم تو یہی ہے کہ ؎

بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

ادب شناسوں کی طرح اپنے مقام عبدیت کو پہچان کر ہدایت اس کی کرتے ہیں کہ دل

اللہ سے لگائے قدم راہ مصطفوی پر اٹھاتے رہو۔ بس اس کے سوا نہ کوئی دوسرا نظریہ اور فلسفہ

بہ منزل کوش مانند مہ نو | دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقام خویش اگر خواہی دریں دیر | بحق دل بند و راہ مصطفیٰ رو

خودداری اور خود اعتمادی کا جو سبق بندۂ مومن کو اسرار خودی و رموز بیخودی کے وقت سے دیتے چلے آرہے ہیں اس کی تکرار ارمغان حجاز میں بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ترقی بلکہ زندگی اور بقا بھی اگر مد نظر ہے تو غیروں کی تقلید حرام سمجھو۔ دوسروں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو، اپنی جگہ پہ قائم رہو اور یہ نہیں تو موت دفنا رکھی ہوئی ہے۔

مسلماں از خودی مرد تمام است | بہ نجاکش تا خودی میرد غلام است
اگر خود را متاع خویش دانی | نگہ را جز بخود بستن حرام است

مسلماناں کہ خود را فاش دیدند | بہر دریا چو گوہر آرمیدند
اگر از خود رمیدند اندریں دیر | بجان تو کہ مرگ خود خریدند

مسلماں رہ کر جینا چاہتے ہو تو وہی راہ مصطفوی کھلی ہوئی ہے کافر ہو کر مرنا منظور ہے تو اس کی راہ دین سے علیحدگی ہے۔

کشودم پردہ را از روئے تقدیر | مشو نومید و راہ مصطفیٰ گیر
اگر باور نداری آنچہ گفتم | ز دیں بگریز و مرگ کافرے میر!

خلافت کی یہ حقیقت اگر ترکوں کی سمجھ میں آگئی ہوتی تو آج ان کی تاریخ کا دامن الغائے خلافت کے داغ سے سیاہ نہ ہوتا۔

خلافت بر مقام ما گواہی است | حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ | خلافت حفظ ناموس الٰہی است!

"دختران ملت" کے نام پیام ہے کئی صفحوں میں مفصل۔ کہیں کہتے ہیں کہ اے بیٹی اسلمان ہو کر کافر عورتوں کی طرح غازہ اور پوڈر کی زندگی تیری شایان شان نہیں تیرے پاس تو

شمشیر نگاہ ہونی چاہیئے وہ شمشیر جو حیا و عفت کے پانی میں بجھی ہوئی ہو اور کہیں اس نکتہ کو کھو لتے ہیں کہ قوم و ملت کی زندگی کا راز اچھی ماؤں کے وجود سے وابستہ ہے اور بہترین مکتب و مدرسہ نگاہ مادری ہے۔ اسی سلسلہ میں آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ اے بیٹی عہد حاضر کی بے حجابی سے بچ کر سیدہ فاطمہ رضؓ کا طریقہ اختیار کر، اور کسی حسین رضؓ کی پرورش کر!

اگر پندے ز درویشے پذیری — ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتولے رضؓ باش و پنہاں شو ازیں عصر — کہ در آغوش شبیر رضؓ بگیری

عمر فاروق کے ایمان لانے کا واقعہ تاریخ میں ہم سب پڑھ چکے ہیں۔ اقبال کی نکتہ رس نگاہ اس اُس واقعہ کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ ابن خطاب کا دل جو اُس وقت تک عداوت اسلام میں پتھر تھا اگر پسیجا، تو ایک عورت (اپنی بہن) ہی کی قراءت قرآن سے! اس لئے اے بیٹی! تو پھر آج قراءت قرآن میں مشغول ہو۔ اور دنیا کو قرآن کی طرف بُلا!

ز شام ما برون آور سحر را — بہ قرآن باز خوان اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قراءت تو — دگرگوں کرد تقدیر عمر را

اقبال کی فارسی اور اردو میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ اصل شئے کلام اقبال سے مانوس ہونا اور پیام اقبال کو سمجھ لینا ہے، اس میں جتنی دیر بھی لگ جائے لیکن بس اس مرحلہ سے گزر چکنے کے بعد پھر کوئی خاص دشواری ان کے کسی کلام کو سمجھنے میں نہیں رہ جاتی ہے اور بغیر اس کے ان کا ہر کلام دشوار ہے تاہم اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ عام ناظرین کے لئے اردو فارسی سے زیادہ قریب الفہم ہے اور یہ حصّہ اردو، جہاں تک بلندی فکر کا تعلق ہے، حصّہ فارسی سے ذرا بھی کم نہیں ہے اس لئے جو لوگ فارسی کے نام سے ڈرے ہوئے ہیں وہ بھی کم از کم اس حصّہ سے پورے لطف اندوز اور اس کتاب کے خلاصے حصّہ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

ایک دوزخی مناجات کر رہا ہے اور اس حال میں یہ کہہ رہا ہے کہ یہاں کا عذاب جو کچھ بھی سہی، لیکن یہ خطہ کم از کم فرنگی تاجر کی غلامی کے عذاب سے آزاد ہے۔

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت — جو کچھ ہے وہ ہے فکر ملوکانہ کی ایجاد!

الٰہ! ترا شکر کہ یہ خطۂ پرسوز — سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

اس انتہائی تعریض پر ایک شعر اکبرؔ الہ آبادی کا بھی یاد پڑ گیا۔ دورِ حاضر کے سامعین کے آگے قدرتِ باری و عظمتِ الٰہی کا بیان کر رہے ہیں اور جب کوئی موثر عنوان سمجھ میں نہیں آتا تو کہتے ہیں۔ "صاحبو! بس یہ سمجھ لو کہ اللہ میاں کو کلکٹر کے اختیارات حاصل ہیں":

اس کی عظمت کا کروں آپ سے کس طرح بیاں — میں تو اللہ تعالیٰ کو کلکٹر سمجھا!

صہ ۲۵۱ پر ایک رباعی کا پہلا شعر ہے

غریبی میں ہوں محسودِ امیری — کہ غیرت مند ہے میری فقیری!

صہ ۲۷۷ پر اس متن کی شرح بھی اقبال کی ذاتی زندگی سے موجود ہے۔ وفات سے کچھ ہی روز قبل — کون جان سکتا تھا کہ وقتِ موعود اتنا قریب آلگا ہے — معتقدوں اور قدردانوں نے "یومِ اقبال" دھوم دھام سے منایا تھا۔ صدرِ اعظم دکن کے دستخط سے ایک ہزار کا چک دعوت کے نام سے وصول ہوا۔ شاعر نے جو قطعہ لکھ کر بھیجا اس کے دو شعر آخری ملاحظہ ہوں

میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا ہر دوش — کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

بہترین اور موثر نظم اس حصہ میں کیا معنی ساری کتاب میں وہ ہے، جو "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کے عنوان سے صہ ۲۱۳ سے صہ ۲۱۸ تک آئی ہے اور جس کے اندر اقبال کی ساری تعلیم کا مغز یا لبِ لباب آگیا ہے۔ ابلیس اپنی مجلسِ شوریٰ میں کہتا ہے کہ

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب — میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں!

غضب ہے کہ میری اس آباد کی ہوئی دنیا کو — "ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خون" کو — آج کارسازِ اعظم برباد کرنے پر تلا ہوا ہے، دیکھوں تو کون ایسا کر سکتا ہے؟ پہلا مشیر کہتا ہے کہ توبہ کیجیے، بھلا کس کی مجال ہے کہ ہمارے نظام کو درہم برہم کر سکے — ہم نے ہر طرح کے انتظامات مکمل کر رکھے ہیں —

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج | صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا | کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام!

دوسرا مشیر پہلے کو دخل در معقولات دے کر بول اٹھتا ہے کہ مجھے شاید جمہوریت و عمومیت کے جدید ہنگامہ کی خبر نہیں! وہ کڑک کر جواب دیتا ہے کہ خبر کیوں نہ ہو اور خبر کیسی، یہ تو خود ہمارا ہی پھیلا ہوا جال ہے، کچھ نام اور اصطلاحیں نئی کر دی ہیں اور اصل حقیقت پہلے سے بھی زیادہ گہری کر دی ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس ؛ جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام ؛ چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

اب تیسرا مشیر گویا ہوتا ہے کہ خیر اور تو سب ٹھیک ہے لیکن مارکس یہودی نے جو سوشلزم اور مساوات کا شرارہ چھوڑ کر رکھا ہے آخر اس کا توڑ ہمارے پاس کیا ہے؟

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب | نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

چوتھا بولتا ہے کہ واہ یہ کونسی مشکل بات ہے؟ سوشلزم کے جوڑ پر ہم نے روما میں فاشزم نہیں کھڑی کر دی ہے؟

پانچواں مشیر لرزتا اور ڈرتا ہوا اپنے سردار کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ آپ ہی جلد خبر لیجئے ورنہ اس کمبخت یہودی نے تو انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے اور قائم کردہ نظام ملوکیت و سرمایہ داری پاش پاش ہو جانے کو ہے۔

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام | اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر وہ روح مزدک کا بروز | ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنون سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرغ | کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے | جس جہاں کا ہے فقط تیری سیاست پہ مدار

آخری تقریر خود ابلیس کی ہوتی ہے وہ کہتا ہے تم میرے اثر و اقتدار کو سمجھتے کیا ہو ان بیہودہ اشتراکیوں سے بھلا میں کیا ڈروں گا ان کی مجال جو میرے نظام تہذیب کو ذرا بھی

دھکا پہونچا سکیں۔

کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام وسبو

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

ہاں البتہ میری تباہت وسیادت کو اگر ڈر ہے تو ایک دوسری امت سے ہے" جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو خود مٹ جانے پر بھی اگر مجھے مٹا دینے کی قوت کسی قوم میں ہے جس کی مناجاتیں پچھلی رات میں اب تک ناغہ نہیں ہوتیں! میری اصلی دشمن ہے تو یہی محمدؐ کی امت ہے۔

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

بس پناہ مانگتا ہوں تو اسی پیغمبرِ عرب کے تیر سے جس کا ہر نشانہ میرے لئے موت ہے حقیقۃً انقلاب آفرین اسی کا لایا ہوا دین اور اسی کا پھیلا ہوا آئین ہے ؎

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف
منعموں کو مال ودولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بچنے کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ خود مسلمان کو خواب غفلت میں مست رکھو اور کبھی راز دانِ دین نہ بننے دو ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

ہے وہی شعر وتصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشا حیات

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

مبارک ہے وہ قوم جس کو ایسا شاعر نصیب ہو مبارک ہے وہ شاعر جو اپنی یادگار ایسا کلام چھوڑ جائے اور مبارک ہے وہ ناشر جسے ایسے کلام کے نشر واشاعت کی توفیق ہوئی۔

▲ ▲ ▲

دو لفظ

"مرد خدا" کی یاد میں!

(حضرت اقبالؒ کی برسی کے موقع پر مانٹگومری کے بزرگوں کی فرمایش پر لکھ کر بھیجا گیا)

صدیوں پیشتر عربی کے ایک صوفی و صاحب حال شاعر ابن الفارض گزرے ہیں۔ کہتے ہیں، جب وقت آخر قریب آیا، اور برزخ کا انکشاف کچھ ہونے لگا، شاعر نے جنتیوں کے منظر دیکھ، منہ پھیر لیا، اور کہا کہ "میری محبت تو ذات سے تھی، اس کا صلہ کل اتنا ہی!" اس پر سامنے سے وہ منظر ہٹا لیے گئے اور کوئی تجلی خاص کی گئی، جس پر عاشق کی روح بیخود ہو کر خود سے نکل پڑی!

کہنے والے کہتے ہیں کہ علاقہ پنجاب کے رہنے والے ایک صوفی بزرگ اور صاحب دل شاعر نے بھی انھیں واردات کو اپنی زبان میں سُنا دیا ہے ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم
گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد
تا نہ بینم رُخِ تو روح رمیدن نہ دہم

یہ بوعلی شاہ قلندر پانی پتی تھے۔ انھیں بھی گزرے ہوئے صدیوں کی مدت ہو چکی اور تاریخ کسی حد تک افسانہ کا رنگ اختیار کر چکی۔ ماضی کو چھوڑ حال میں آیئے اور سند روایت کی لائیے۔

آج سے ٹھیک دس برس پہلے اسی ماہ اپریل میں لاہور کی سرزمین پر ایک نامور شاعر اور بیرسٹر

اور فلسفہ کا ڈاکٹر، بیماریوں سے چور، جسم زار و رنجور، اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گزار رہا ہے معالجین، مایوس ہو چکے ہیں، تیماردار قدرتی طور پر تشفی و تسلّی کی باتیں کہتے ہیں، تو وہ جاں لب مریض، بجائے کسی قسم کا خوف و ہراس محسوس کرنے کے، الٹا ان تیمار داروں کو تسکین دیتا ہے اور زبان سے یہ غیر فانی الفاظ نکلتا ہے کہ

"میں مسلمان ہوں موت سے نہیں ڈرتا

پھر معاً اپنا شعر بھی سنا دیتا ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم | چو مرگ آید تبسم بر لب اوست!

اللہ اکبر! اتنا اطمینانِ قلب اُس گھڑی بجز مردِ مومن کے نصیب بھی اور کسے ہو سکتا ہے؟

۲۰ اپریل کی شب گزری، ۲۱ اپریل کی صبح طلوع ہونے لگی، پانچ بجکر ۵ منٹ کا وقت ہے۔ دم توڑتا ہوا شاعر اپنے واحد تیماردار کو اپنی رباعی سناتا ہے ؎

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید | نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے | دگر دانائے راز آید کہ ناید

وعدہ کی گھڑی اپنے وعدے پر آتی ہے، اور عجب نہیں کہ "نسیمِ حجاز" ہی کی شکل میں آئی ہو اور بولتے ہوئے شاعر کی آواز آخری بار" یا اللہ کہہ کر اور قبلہ رُو ہو کر اس عالم ناسوت میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی ہے ۔۔ مرنے والا سکون و اطمینان، بے ہراسی و خوش اعتمادی کی موت کی ایک مثال قائم کر جاتا ہے۔ آیہ کریمہ یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ کی ایک زندہ اور بولتی ہوئی تفسیر!

لاہور کو خصوصاً اور پنجاب کو عموماً، مبارک ہو کہ فلسفی اور شاعر اور سود درویشوں کا ایک درویش، یہیں کی خاک سے اٹھا، اور یہیں کی خاک میں ملا!

اُس کا یہ انجام کیوں نہ ہوتا؟ اس سے بڑھ کر توحید کا پرستار اور شیدائی اور معہدا کون ہے؟

ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ | سازِ ما را پردہ گرداں لا الٰہ

لا اِلٰہ سرمایۂ اسرارِ ما ۔۔۔ پردہ بند از شعلۂ افکارِ ما

اور وہی تو یہ بھی کہہ چکا تھا ؎

دین از و حکمت از و آئیں از و ۔۔۔ زور از و قوت از و تمکیں از و

وہی تو اپنی حقیقت یہ بیان کر چکا تھا ؎

نہ با صوفی نہ با مُلا نشینم ۔۔۔ تو می دانی کہ من آنم نہ اینم

نویس اللہ بر لوحِ دلِ من ۔۔۔ کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم

عشق عشق کی صدا سب لگاتے ہیں اور عاشقی کا دعویٰ سب کر گزرتے ہیں اس نے عاشقی کا لب لباب ان الفاظ میں نکال رکھا تھا ؎

عاشقی توحید را بر دل زدن ۔۔۔ وانگہے خود را بہر مشکل زدن

عاشق نے اسی کلمۂ توحید کے سہارے اپنے کو ہر مشکل میں ڈالا، اور ہر مشکل اس کے لئے آسان ہو گئی۔ آتشکدہ اُن کے حق میں گلزارِ خلیل بن گیا اور جب زندگی کی سب سے کٹھن گھڑی آئی، جس کے تصور سے اچھے اچھے اتقیا و ابرار بھی لرزتے رہتے ہیں۔ تو اُس کے کان میں فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کی جاں پرور وجاں بخش صدا آئی اور وہ "مردِ خدا" معاً اپنے خدا اور خدا کے آغوشِ شفقت میں جا بیٹھا۔

علامہ اقبال کے خطوط

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام

لاہور

۶؍ جنوری سنہ ۱۹۲۲ء

مخدومی، السلام علیکم

نوازش نامے کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کے مختصر الفاظ نے اس موقع پر میرے جذبات کی نہایت صحیح ترجمانی کی ہے۔ حالات مختلف ہوتے تو میرا طریق عمل بھی اس بارے میں مختلف ہوتا لیکن یہ بات دنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ اقبال کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں کھلی کھلی جنگ اسکی فطرت کے خلاف ہے۔

اسرار خودی کا ریویو دیکھنے کا منتظر ہوں سی، آر، داس کا خطبہ صدارت کانگریس آپنے دیکھا ہوگا۔ اُس نے اسی روحانی اصول کو سیاسی رنگ میں پیش کیا ہے۔ اُمید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

لاہور

۱۷۔ اپریل سنہ ۱۹۲۲ء

مخدومی، السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ مجھے آپ سے قلبی تعلق ہے اس واسطے ہمیشہ آپ کے خط سے مسرت ہوتی ہے۔ "پیام مشرق" اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔ چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں لیکن افسوس ہے انہیں ختم نہ کر سکا۔ فکر روزی قاتل روح ہے یکسوئی نصیب نہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ والد مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے اسے شائع کر دیا جائے۔ آپ کے نوجوان دوست کے تبصرۂ پیام بھی شوق سے پڑھوں گا۔ میرے ایک سکھ دوست اسرار خودی کا بھگوت گیتا سے مقابلہ کر رہے ہیں انکی

تحریر انگریزی میں ہو گی۔

میرے کلام کی مقبولیت محض فضلِ ایزدی ہے۔ ورنہ اپنے آپ میں کوئی ہنر نہیں دیکھتا اور اعمالِ صالحہ کی شرط بھی مفقود ہے۔

مولینا کی کتاب فیہ مافیہ کو آپ خود ایڈٹ کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں وسائل ایڈٹ کرنے کے بہت زیادہ ہیں۔ لیکن آخری ہندی مسلمانوں کو بھی تو یہ کام کچھ نہ کچھ شروع کرنا ہے۔ میری رائے میں آپ یہ ضروری کام خود کریں۔ بعد میں یوروپین ایڈیشن بھی نکل آئے گی۔ جوہر کے نعتیہ کلام کو میں نے بھی خاص طور پر نوٹ کیا ہے۔ بلکہ میں تو ان کے روحانی انقلاب کو ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں۔

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص : محمد اقبال

لاہور

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء

مخدومی، السلام علیکم

"پیامِ مشرق" میں چند اشعار "بوئے گل" پر ہیں جو آپ کے ملاحظہ سے گزرے ہونگے۔ آخری شعر ہے۔

زندانی کہ بند نہ پائش کشادہ اند

آہے گذاشت است کہ بُو نام دادہ اند

حال میں جامعہ ملیہ علی گڈھ کے رسالے میں "پیامِ مشرق" پر ریویو کرتے ہوئے مولانا محمد اسلم جیراجپوری "آہے گذاشت است" پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترکیب مکروہ معلوم ہوتی ہے یہی مطلب کسی اور طرح ادا کرنا چاہیئے۔ میں آپ کا خیال معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مولینا سید سلیمان ندوی صاحب سے بھی استصواب کروں گا۔ چونکہ دوسری ایڈیشن جلد نکالنے کا ارادہ ہے۔ اس واسطے اگر آپ کا جواب جلد مل جائے تو بہتر ہو۔ امید کہ مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص : محمد اقبال۔ لاہور

مکرمی۔ پیامِ امن کے لئے شکرگذار ہوں۔ آپ کا تبصرہ بجائے خود ایک نہایت مفید رسالہ ہے۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص: محمد اقبال

۳۔ نومبر ۱۹۲۳ء

نوٹ: مکتوب الیہ نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ مع اپنے مفصل تبصرہ کے شائع کیا تھا۔

لاہور

۲۶۔ نومبر ۱۹۲۴ء

مخدومی، السلام علیکم

ابھی ایک عریضہ ڈاک میں ڈال چکا ہوں کہ آپ صاحبزادہ صاحب کی خدمت میں فوراً خط لکھیں کہ وہ تجویز معلومہ کورٹ کے سامنے پیش نہ کریں۔ کم از کم مجھ سے ملے بغیر پیش نہ کریں۔ والسلام۔ تاکید مزید عرض کرتا ہوں۔

مخلص: محمد اقبال

لاہور

۲۲ مارچ ۱۹۲۵ء

مخدومی، السلام علیکم

والانامہ مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ مگر آپ کا نوٹ پڑھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے عدیم الفرصتی کی وجہ سے آپ نے وہ مضمون بہت سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ بہر حال میں آپ کا خط زیرِ نظر رکھوں گا۔ مضمون کا مسودہ ارسال فرمائیے۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص محمد اقبال

نوٹ:۔ اقبال نے اپنے ایک انگریزی مقالہ "اجتہاد" پر رائے طلب کی تھی اور جو رائے دی گئی خاصی مخالفانہ تھی۔

لاہور

۵ر جنوری ۳۰ء

مخدومی۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ کل موصول ہوا جس کے لئے شکریہ قبول فرمائیے۔

میں بھی ایک ہفتہ کیلئے علی گڈھ گیا تھا وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ سید راس مسعود بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی مساعی سے یونیورسٹی کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوگی۔ آپ بھی کبھی کبھی وہاں جایا کریں اور مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگو نہیں کیا کریں۔ نتائج بہت اچھے ہوں گے۔ باوجود بہت سی مخالف قوتوں کے، جو ہندوستان میں مذہب کے خلاف اور بالخصوص اسلام کے خلاف) اس وقت عمل کر رہی ہیں، مسلمان جوانوں کے دل میں اسلام ہی کیلئے تڑپ ہے لیکن افسوس ہے کوئی آدمی ہم میں نہیں جسکی زندگی قلوب پر مؤثر ہو۔

بانگ درا کے تیسری ایڈیشن، جس کی تعداد دس ہزار ہوگی، چھپ رہی ہے غالباً دو ماہ تک تیار ہو جائے گی۔

لاہور کانگریس نے آزادی کامل کا اعلان کر دیا ہے۔ جماعتی اختلافات کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا دیکھیں ہندوؤں کا لبرل گروہ ان اختلافات کا کیا فیصلہ کرتا ہے مسلمانوں میں آزادی کیلئے ایک ولولہ موجود ہے، مگر

مشکل ایں نیست کہ بزم از سر ہنگامہ گذشت
مشکل ایں است کہ بے نقل و ندیم اند ہمہ

مخلص محمد اقبال

لاہور

۲۷ر جولائی ۱۹۳۰ء

جناب مکرم۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لئے شکریہ قبول فرمائیے۔ میں بڑی خوشی سے ایڈریس

لکھوں گا لیکن اسی دسمبر میں نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو شاید میں ہندوستان میں نہ ہونگا اور اگر ہوا تو ایک اور ایڈریس لکھنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ ہاں آئندہ سال اگر سید راس مسعود چاہیں تو میں حاضر ہوں۔

آپ نے اپنے اخبار میں میرے مضمون کا ذکر کیا ہے جو انگریزی اخباروں میں چھپا ہے۔ عرض یہ ہے کہ یہ اصل میں ایک انٹرویو تھا جو ہنگری کے ایک اخباری نامہ نگار کو دیا گیا تھا۔ اس نے بعض خاص سوالات کئے تھے۔ جن کے جواب دیئے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اس نے اس انٹرویو کو ایک مستقل مضمون کی صورت دے کر انگریزی اخبارات میں بھیج دیا اور بہت سی ضروری باتیں چھوڑ گیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس کے مضمون کا ربط قائم رہے۔ تعجب ہے کہ لکھنؤ کے اخبار ہمدم میں کسی صاحب نے اس پر اعتراضات کئے ہیں جنہوں نے مضمون مذکور کے مقاصد کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھا۔

آپ نے اپنے پہلے خط میں "وطنیت" کے اصول پر اسلام کے اصولِ اجتماعی کو ترجیح دینے میں مجھے امام العصر کہا ہے جس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ ایک نیشنلسٹ اخبار جس کے چار ایڈیٹر ہیں اور چاروں مسلمان ہیں اور جس کا پہلا نمبر لاہور سے آج ہی نکلا ہے۔ لکھتا ہے کہ اقبال نے "وطنیت" کا غدر نگ تراشا ہے۔ ! دیکھا مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان روحانی اعتبار سے کتنے فرومایہ ہیں۔ انکو معلوم نہیں کہ اسلامیت کیا ہے اور "وطنیت" کیا چیز ہے؟ "وطنیت" ان کے نزدیک لفظ وطن کا محض ایک مشتق ہے اور بس۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔

محمد اقبال

مخدومی۔ آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے۔ "سچ" کے دو نمبر بھی مل گئے تھے، جن کے لئے شکر گزار ہوں۔ گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے بہت دردمند کر دیا ہے اس لئے جلسوں میں میرے واسطے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ میں کہیں نہیں جا رہا نہ پٹنہ نہ کانپور۔ امید کہ مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام۔

محمد اقبال۔ لاہور
۲۴ ستمبر ۱۹۳۳ء

نوٹ: پٹنہ اور کانپور میں اس سال بہت اہم قومی اجتماعات ہو رہے تھے۔

مکرمی۔ السلام علیکم

جہاں تک مجھے معلوم ہے لفظ برزخ کا کوئی ترجمہ انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ بعض مترجمین قرآن نے لفظ Barrier لکھا ہے مگر یہ بھی درست معلوم نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لفظ برزخ ایرانی لفظ "بروک" کا معرب ہے۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ قدیم ایرانیوں کے نزدیک "بردک" کا کیا مفہوم تھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ موت۔ برزخ۔ حشر ونشر وغیرہ Biological اصطلاحات ہیں اور انکی حقیقت کچھ معلوم نہیں سوائے اس کے جو صوفیائے کرام نے اپنے مکاشفات کی بنا پر لکھی ہے۔ میری رائے میں تو برزخی زندگی کا ترجمہ 'Burzukh Life' ہی کریں۔ لیکن حقیقت برزخ پر ایک مفصل نوٹ دینا ضروری ہے۔ اس نوٹ میں موت۔ حشر وغیرہ کی حقیقت بھی اسلامی نقطۂ خیال سے واضح کرنی چاہیئے۔ والسلام

محمد اقبال ۱۹۔ جون ۱۹۳۴ء

نوٹ:۔ مکتوب الیہ نے اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن کے سلسلہ میں دریافت کیا تھا کہ لفظ برزخ کو انگریزی میں کیونکر منتقل کیا جائے۔

مخدومی۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لئے شکریہ قبول فرمائیے۔ میں خدا کے فضل و کرم سے اچھا ہوں۔ صحت عامہ تو قریباً بحال ہوگئی ہے۔ البتہ آواز میں ابھی کسر باقی ہے۔ یہاں کے کالجوں کے مسلمان طلبہ کی ایک جمعیت ہے۔ انہوں نے ایک اپیل شائع کی تھی کہ اقبال کے لئے جمعہ کے روز مسجدوں میں دعا کی جائے۔ اس اپیل سے اخباروں اور ان کے ناظرین کو غلط فہمی ہوئی۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا اور ترجمۃ القرآن کا کام جاری ہوگا۔ والسلام

محمد اقبال

۲۸۔ اپریل ۱۹۳۶ء

اقبال اکیڈیمی

مدینہ منشن۔ نارائن گوڑہ، حیدرآباد ۲۹ ۵۰۰۰

اقبال کی فکر اور شاعری ہمارے تہذیبی سرمایہ کا ایک گراں بہا وجود ہے۔ اقبال دور حاضر کے ان عظیم مفکروں میں سے ہیں جن کی فکر و نظر مشرق و مغرب کی مصنوعی سرحدوں سے بالاتر ہے۔ جمعیت آدم ان کا نصب العین تھا اور احترام آدم ان کے نزدیک تہذیب کی منزل۔

- اس پس منظر میں اقبال کے پیام کو عام کرنے کے لئے ۲۸ جون ۱۹۵۹ء کو اقبال اکیڈیمی کا قیام عمل میں آیا۔
- مقاصد ۰ افکار اقبال کی اشاعت۔
  - ۰ ایسے نظریات کی تحقیق جن پر فکر اقبال مبنی ہے۔
  - ۰ علمی و ادبی شعور کی نشو و نما۔

ان مقاصد کی عملی صورت گری کے لئے اقبال اکیڈیمی حسب ذیل خطوط پر مصروف عمل ہے۔

- ہر سال یوم اقبال اور نمائش کا انعقاد
- اقبالیات پر کتابوں کی اشاعت
- ہر ماہ محافل اقبال، توسیعی تقاریر اور سمپوزیم کا اہتمام
- اقبال کی تصانیف پر ہفتہ واری لکچرس
- اقبال کے فارسی کلام سے استفادہ کے لئے فارسی زبان کی کلاسس
- اقبالیات پر مشتمل ایک معیاری کتب خانہ

رکنیت

عام رکنیت سالانہ	(۱۰) روپیے
تاحیات رکنیت	(۲۰۰) روپیے
سرپرستی	(۱۰۰۰) روپیے

پرنٹر و پبلشر کریم رضا معتمد اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد نے جے رام پریس، چھتہ بازار میں چھپواکر دفتر اقبال اکیڈیمی مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد سے شائع کیا۔
ٹائیٹل کی طباعت جے رام پریس کے لئے انتخاب پریس حیدرآباد نے کی۔

January, 1979

IQBAL REVIEW

Quarterly Journal of the Iqbal Academy, Hyderabad.

IQBAL ACADEMY
Madina Mansion, Narayanguda,
Hyderabad-500029 (A. P.) India,
Phone : 4 5 2 3 0